آخری بہار
مرزا میر حاکم

آخری بہار

مرزا امیر حاکم

پہلا باب

قمقمے

......قمقمے......
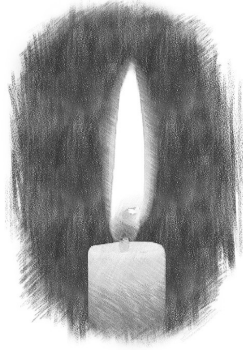
ہوسٹل کی چھت پر بیکار دو گھنٹے کھڑے رہنے کے بعد عام طور پر نیند کے آثار نظر آنے لگتے ہیں، اسے بھی آنے لگے۔ رات کے پونے بارہ تھے اور چاندنی ہر طرف دل کھول کر برس رہی تھی۔ ستائے ہوئے دلوں کو رک جانے کا ایک اور موقع فراہم کرتی ہوئی اور وہ جو کسی کی ایک عام سی رات کو خاک سے خاص اور خوبصورت بنا دیتی ہے اور بجھے ہوئے چراغوں میں ایک انجانی سی روشنی بھر دیتی ہے......وہی چاندنی جو کچھ کچھ امید امید سی اور کچھ کچھ نا امید نا امید سی نظر آتی ہے۔

اس نے چوتھا سگریٹ سلگایا، ایک عجیب بے ڈھنگا سا کش لیا اور پھر گذشتہ تین سگریٹوں کی طرح پھر کش لگانا بھول گیا۔ سگریٹ اور خیال کچھ دیر کے لیے جلتے رہے اور تب نیچے سیڑھیوں پر سے کسی کے قدموں کی مدھم آواز سنائی دینے لگی۔ کوئی چھت پر آ گیا، وہ مڑا نہیں۔

سر کو اک جھٹکا دے کر اس نے صرف اتنا کہا: ''جاگ رہے ہو؟'' سننے والے کو ایسا لگا جیسے اس کے چہرے پر مسکراہٹ ہو، اسے نظر تو نہیں آئی لیکن الفاظ کی ملائمت سے اس بات کا بخوبی اندازہ لیا جا سکتا تھا۔

آنے والا وہیں رک گیا دروازے کے پاس اور بولا: ''ہاں جاگ رہا تھا......سوچا باقی سب سو رہے ہوں گے اس لیے گئے رات چھت پر جا کر سگریٹ پیتا ہوں''

وہ دونوں ہنس پڑے۔ ہنسی خاموشی میں گھل گئی اور چاند نے بھی چاندنی بڑھا کر مسکرانے کا اظہار کر دیا۔ اس نے چاند کی طرف دیکھا اور سوچا......

نہ جانے کیوں اپنی اداسی میں چاند بھی اداس اور خوشی میں خوش نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں نہ چاند کا خوشی سے تعلق ہے اور نہ اداسی سے مگر دیکھنے والے اس کو ان چیزوں جوڑے جاتے ہیں جن سے وہ دور دور تک آشنا نہیں۔

''کیا کر رہے ہو یہاں؟'' وہ لڑکا یہ کہہ کر دروازے کے ساتھ فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ نیچے بیٹھتے ہی اس کے منہ سے ایک چھوٹی سی آہ نکلی، یقیناً فرش بے حد ٹھنڈا لگا ہوگا، نومبر شروع ہو چکا تھا یعنی راتوں کو ٹھنڈ پڑنی شروع ہو چکی تھی۔ نومبر کی ابتدا سے ہر رات ہلکی ہلکی پھوار آسمان سے اترتی ہے اور دن میں آنے والی سردی کے لیے بنیادیں ڈالتی ہے کسی عام باپ کی طرح جسے بیٹی کے جہیز کی خاطر بیس سال پہلے ہی سے فاقے شروع کرنے پڑتے ہیں......

سہنے والے جتنا سہہ لیں دنیا کی تاب نہیں لا سکتے، اس کا معیار انوکھا ہے جو وہ خود بھی پرکھ نہیں سکتی!

''تو کچھ نہیں، چلیں'' سگریٹ پھینک کر وہ واپس مڑا اور اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر کھڑا ہو گیا۔ کتنا پیارا لگتا ہے نا جب کوئی ایسا کرتا ہے عموماً لڑکے کیونکہ لڑکیاں پینٹ شرٹ یہاں پاکستان اور ہندوستان میں بہت کم پہنا کرتی ہیں جو پہنتی بھی ہیں تو لڑکوں کو بری لگتی ہیں۔

دو چار گھڑی وہ فرش پر بیٹھے اپنے دوست کو دیکھتا رہا۔ چاند کی تیز سبز روشنی، دور کے ان پہاڑوں کے پاس والے سمندر کی ہواؤں کو چومتی ہوئی اس کے بالوں میں بکھر رہی تھی۔

''آنند! (Aanand)'' اس لڑکے نے اسے جاتے ہوئے روک لیا۔

''ہاں کیا ہے؟''۔ ہوا کی سائیں سائیں بڑھ گئی۔

''روہت (Rohit) بتاؤ مجھے نیند آرہی ہے بہت، ویسے بھی صبح کالج میں فنکشن ہے جلدی پہنچنا ہے ہمیں'' اس ہلکی روشنی میں کوئی قمقمے اس کی آنکھوں کے قریب لاتا تو اس کی لال لال آنکھیں اسے صاف نظر آجاتیں۔ ہوسٹل جب سے تبدیل ہوا تھا نینداس کے ہاتھ سے ایسے گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ، ورنہ پہلے نہ اس نے اتنی رات کو سگریٹ پی تھی اور نہ ہی اتنی رات کو چھت پر ٹہلنے کی عادت پالی تھی۔

روہت خاموش رہا، کافی دیر...... اسے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی کوئی رنگ نہیں دیکھا ہوگا لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی یہ آنند کا پکا یقین تھا۔ روہت زیادہ تر بے رنگ لگتا ہے اور کسی نہ کسی دن یہ احساس بھی دل سے ٹکراتا ہے کہ دنیا کے سبھی رنگ اس نے اپنے اندر جذب کر لیے ہیں، مانو ایک ایسا رنگ ہے جو اتنا گاڑھا ہے کہ بالکل سیاہ لگتا ہے، پر نظر ڈالنے والوں کو یہ شبہ تک نہیں ہوتا کہ اس کا رنگ سیاہ نہیں تھا، وہ تو کوئی اور تھا۔ وہ سیاہ نہیں ہو سکتا، وہ گاڑھا نیلا تھا یا سرخ یا پھر چاند کی طرح سبز یا سورج کی طرح سنہرا، جو اب ان میں سے کوئی نہیں بھی رہا۔

''میں کل چلا جاوں گا'' روہت نے آخر کار اپنے ہونٹ ہلائے۔

''کہاں؟''

''وہ......آدمی تمہیں یاد ہے جس سے کچھ مہینے پہلے لاہور سٹیشن پر ملاقات ہوئی تھی۔وہ جس کی یہ موٹی سی عینک تھی (ہاتھ سے عینک کی چوڑائی دیکھا کر)، یاد ہے تمہیں؟'' روہت کہتا گیا اور آنند سوچ میں ڈوبتا گیا۔اس کا ہاتھ جیب سے نکل کر ہونٹوں کے قریب پہنچ گیا۔

''ہاں ہاں یاد ہے کیا نام تھا ان کا......ڈاکٹر؟......ڈاکٹر؟''

''ڈاکٹر راجندر!''

''ہاں ڈاکٹر راجندر، لیکن کیا ہوا؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

''مجھے آج سویرے ہی بشیر عالم کی چٹھی ملی ہے اس نے بتایا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے یہی چند دن پہلے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ......'' روہت بات کرتے کرتے یک دم رک گیا، ہوا کا رخ بدلا اور چاند نے بادلوں کا لحاف اوڑھ لیا۔

''کیا بات؟''

''کہ وہ مرنے سے پہلے مجھے کچھ بتانا چاہتے تھے!...... پتہ نہیں کیا ہوگا''

''کیسے ہوئی موت؟'' آنند چاند کی طرف منہ پھیر کر بولا۔

روہت خاموش تھا، ایک چھوٹا سا جھکڑ چلا جس سے ریت کے کچھ زرے آنند کی ایک آنکھ میں داخل ہو گئے۔آنکھ میں فوراََ سے پہلے ہی سیلاب آ گیا۔جراثیم آنکھوں میں دخل ہوں تو اس کی نمی بڑھ جاتی ہے اور وہ نمی جسم کا ردعمل ہوتا ہے، یہ ردعمل ہمیشہ فائدہ مند رہے گا، جسم کی صحت کی طرح رشتوں میں بھی کبھی کبھی ایسے جراثیم داخل ہوتے ہیں، اور جن رشتوں کی **Immunity** کمزور ہوتی ہے وہ مر جایا کرتے ہیں۔

''مرڈر......بشیر عالم نے یہی بتایا ہے''

آنکھ ملتے ہوئے وہ بولا؛''لاہور جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''ہاں لیکن......''

آنند نے فوری طور پر جواب دیا؛''لیکن کیا، **K2** ٹرپ پر بھی تمہارے ساتھ تھے وہ، اچھی خاصی دوستی تھی تمہاری ان کے ساتھ، تمہیں جانا چاہیئے'' روہت نے جسم کو دھیرے دھیرے سیدھا کرتے ہوئے ہولے سے کہا؛''آنند......میں چاہتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آو، لاہور''

آنند اچھل پڑا اور آنکھ ملنی بند کر دی۔''میں؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!''

''آنند میری بات سنو، آنند!''۔روہت نے لگ بھگ چیخ کر اس کو روکا۔دروازے کے پاس

رک کر وہ مڑا اور اندھیرے میں بھی آنکھیں سکیڑ کر بولا: ''میرا کیا کام ہے وہاں، تم نے جانا ہے تو جاو، تمہاری دوستی تھی ان سے میری تو نہیں تھی! اگر لازمی کسی کو لے کر جانا ہے تو وجے کو لے جاو، ویسے بھی اسے لاہور دیکھنے کا بہت شوق ہے''

اس کے بعد وہ قدرے نرم لہجے میں بولا: ''دیکھو روہت، اگر تم کو جانا ہے تو چلے جاو، ویسے بھی وہ بات کونسی خاص ہوسکتی ہے، امتحان قریب ہیں پٹ پٹ کے فیل ہوگے، اونھ''

روہت ایک بچے کی طرح التجا کرنے لگا: ''آنند پلیز آجاو میرے ساتھ، تم لاہور کے چپے چپے سے واقف ہو ،تمہارا تو گھر ہے لاہور میں، مجھے تمہارے گھر والوں سے ملنے کا بھی موقع مل جائے گا''۔ آنند پر ایسے ہی حربے بہت چلتے تھے اس لیے روہت نے جذباتی داو پیچ استعمال کیے۔

''آنند پلیز! دوست کے لیے اتنا بھی نہیں کروگے؟'' وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح آنند کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ہاتھ بے حد یخ تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ صرف دو انگلیاں تھیں جو گرم تھیں۔ ایک مڈل فنگر اور دوسری انڈیکس فنگر۔ (سگریٹ کی وجہ سے)

چاند نے بادلوں کا نقاب چاک کیا اور آنند کا جواب سننے کے لیے ہوا ایک لمحہ خاموش ہوگئی۔

آنند کی بے جان آواز نکالی: ''ٹھیک ہے کل جائیں گے اور جلد سے جلد واپسی ہوگی ہماری، امتحانات ہماری گردن تک پہنچ گئے ہیں پہلے تو میں کالج کے فنکشن کے خلاف ہوں اور اب جناب......''

روہت نے بات کو بیچ میں کاٹا: ''ہاں ہاں! اب ہم دونوں چند دنوں کے لیے کہیں جا رہے ہیں تو پڑھائی کو بھاری نقصان ہوگا، تم بھی بالکل پروفیسر ہٹلر کی طرح بنتے جا رہے ہو''۔

آنند دروازے کی جانب بڑھا لیکن روہت نے دوبارہ روکا۔

''اب کیا ہے؟'' وہ چڑ گیا۔

''کچھ نہیں'' روہت نے مسکرا کر یہ دو الفاظ ادا کیے اور آنند کے چلے جانے کے بعد وہ کافی دیر ان سیاہ بابوں کے متعلق سوچتا رہا جو قسمت اور زمانے نے ان کے منہ پر مارنے تھے۔ چھپے راز اور اندھیری حقیقتیں کبھی اچھی نہیں ہوتیں......اسے معلوم ہونے والا تھا کہ بچپن میں سنا محلے کے ایک بھنگی کا فلسفہ......کیا سچ تھا یا جھوٹ یا فلسفے سچے یا جھوٹے ہوتے ہی نہیں......وہ تو اسی میں ڈھل جاتے جس پہ آپ یقین کرنا چاہتے ہوں......

☆☆☆

کھڑکی میں تاروں سے لدا آدھا آسمان دیکھائی دے رہا تھا۔ وہ چمکتے ننھے ننھے سفید تل اس کی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرح......آسمان کے ماتھے کی بندیا کے آس پاس بھٹک رہے تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھی، ٹیلیفون کافی

دیر ہوئے کان سے چپکائے ہوئے تھی۔ کبھی ایک کان تو کبھی دوسرا کان۔ دوسری طرف سے کسی نے فون اٹھا لیا۔

''ہیلو...... ہاں! (مسکراتے ہوئے)...... ایک دن بعد، اچھا بہتر...... سالگرہ پر آوں گی نا تب دیکھا دینا...... اس نے بتایا کہ رابعہ اور سلمہ بھی آ رہی ہیں...... یہ تو بہت اچھا ہوا...... اچھا، چلو ٹھیک ہے...... بائے'' فون رکھ کر وہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

کھڑکی جو صوفے کے پشت میں تھی اور جو لان کی طرف کھلتی تھی اس میں سے کوئی پرچھائی گزری۔ پرچھائی نے ایک لمحہ کھڑکی کے اندر دیکھا۔ روشنی بس اس کے آدھے دھڑ پر پڑ رہی تھی، اوپر کا حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیاہ جوڑا اور سفید چٹری، کلائی پر گھڑی کے بجائے سفید رنگ کی چوڑیاں تھیں جنہوں نے کھڑکی کے پاس معمولی سی چھن چھن کی۔ دو لمحے ٹھہرنے کے بعد وہ ہٹ گئی۔

یقیناً وہ پرچھائی پاس کے دروازے کی طرف بڑھی ہوگی۔ وہ اٹھی اور میز پر پڑے جگ سے پانی کو ایک گلاس میں انڈیلنا شروع کیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پھر قدموں کی زرا سی چاپ سنائی دی۔

''ہیلو!'' سیاہ جوڑے والے نے اندر جھانک کر تقریباً چلا کر کہا۔ پانی کا گلاس ڈر کے مارے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور نیچے ٹھا کی آواز سے گرا۔ ایک اٹھارہ بیس سال کی لڑکی...... خوبصورت مگر زیادہ نہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ تین بٹہ پانچ تھی وہ۔

''ارے گلشن! تم!'' اس نے چہک کر کہا اور پیاس کو حیرت و مسرت کے صحرا میں کہیں گم ہونا پڑا۔

اب آئیروز کوئی نہ کوئی مہمان آن مرتا، زیادہ تر نمرہ باجی سے ملنے آتے اور کچھ تھیں جو اس سے ملنے آتی تھیں۔ نواز بھائی کے دوست آتے لیکن ان کی آجا صرف بیٹھک میں ہوتی، وہ تو ان میں ایسا اڑا رہتا کہ دن بھر سر کھجلانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اور کبھی کبھی وہیں بیٹھک میں رات گزرانی پڑتی جس پر بڑی ماں ہر وقت چڑتی کڑتی رہتیں اور کوئی سنے نہ سنے بس چک چک کرتی رہتیں۔

وہ دونوں لان میں ٹہل ہوتے باتیں کرنے لگیں۔ اجالا نے خاکستری رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے اور دبٹہ سفید رنگ کا۔ بننے سنورنے کی وہ زیادہ شوقین نہ تھی۔ جو شوق تھے مثال کے طور پر اپنی ڈھائی درجن سہیلیوں سے باتیں کرتے رہنا، خطوط اور اپنی ڈائری پر قلم گھسنا اور گھر کا اکا دکا کام کرنا اور بس......

بڑے سے لان میں ہر طرف بلب جلنے لگے، ایک ایسی تصویر بن گئی جسے دیکھنے پر دل کو راحت کی ٹھیس پہنچتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ سارے رات اس میں ٹہلتے ہوئے گزار دی جائے۔ مالی نے کچھ ہی گھنٹے پہلے پانی دیا تھا اور سبزے کے زیادہ تر حصے اب بھی گیلے تھے۔ ہر چیز پر اس مہک کا لبادہ بیٹھا تھا جو خشک مٹی پر پانی پڑنے کے بعد اٹھا کرتی ہے، جو بہت ہی اچھی لگتی ہے، جسے سونگھنے پر بچپن میں مٹی کھانے کا جی چاہتا

تھا۔

''تم کیوں نہیں جا رہی؟'' اجالا نے گلاب توڑتے ہوئے پوچھا۔گلشن نے نہیں سنا، اس کی نگاہیں دوسری منزل پر موجود نواز کے کمرے کی کھڑکیوں پر منڈلا رہی تھیں۔

''گلشن......کہاں کھو گئی'' گلشن کا خیال اجالا کی طرف لوٹا آیا،اس نے زبردستی مسکرا کر کہا؛

''آوں گی ضرور آوں گی، کس نے کہہ دیا تم سے''

اس کی نگاہیں دوبارہ انہی کھڑکیوں کے آس پاس گردش کرنے لگیں، کھڑکیوں سے وہ گیلری کی طرف اور پھر گیلری سے پاس کے گیراج کی طرف، جس میں ایک گاڑی کھڑی تھی اور دوسری گاڑی کی جگہ خالی تھی۔

''حیرت ہے ابھی شائلہ سے بات ہوئی تھی وہ تو کہہ رہی تھی کہ تم نہیں آو گی'' اجالا گلاب سونگھتے ہوئے بولی، گلشن نے اس سے گلاب لے کر اپنے ہونٹوں سے لگایا۔باہر سے گاڑی کے ہارن بجنے کی آواز آئی۔نوکر نے دوڑ کر بڑا سا گیٹ کھولا، گیٹ نے اپنا منہ کھولتے ہوئے چاں کی آواز نکالی اور ایک چھوٹی، پچکی لیکن خوبصورت سی گاڑی اندر داخل ہوئی۔لان سے روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی،اس مدھم روشنی میں وہ کار ہلکے مالٹائی رنگ کی لگی،شاید رنگ پیلا ہو یا سبز جو گرد و دھول کی وجہ سے بدل گیا ہو۔

اس کار میں سے ایک نوجوان نکلا،عمر اس کی لگ بھگ اجالا جتنی ہوگی،یعنی بیس سال۔وہ دلکش تو نہیں تھا لیکن اس کے کپڑے ضرور دلکش تھے۔سانولی رنگت،جینز کے اوپر اس نے لیدر کا کوٹ پہن رکھا تھا،چھوٹی باریک مونچھیں جنہیں کبھی کبھار دیکھنے پر ایسا لگتا گویا ایک لکیر ہے جو کسی نے مارکر سے کھینچی ہے اور نظریں......نظریں اس کی خصوصی طور پر تیز تھیں،یعنی ایسی تھیں جو تیر چلا دیں،عام تام سی لڑکیوں کے دلوں میں سے آر پار ہو جائیں۔

نواز،ان کی طرف آ رہا تھا۔گلشن ٹہلتے ہوئے جم گئی، اس کی نگاہیں اس نوجوان کے چہرے پر ٹھہر گئیں اور گلاب اس کے ہاتھ چھوٹ سے کر نیچے گر گیا۔وہ گاڑی کی چابی اپنے انگلی میں گھماتا ہوا آیا۔گلاب پر بوٹ رکھ کر گلشن پر مسکراتے ہوئے نظر ڈال کر نکل گیا اور گلشن مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

''ڈنگر'' بے اختیار اجالا زیر لب بولی۔

''آو گلشن،ہم جھولے پر بیٹھتے ہیں'' زمین سے اجالا نے وہ پسا ہوا گلاب اٹھا لیا۔

☆☆☆

دیر ہوئی تو تھی مگر زیادہ نہیں۔وہ دونوں بھنائے ہوئے تھے حالانکہ پروفیسر زکی نے انہیں جلد جانے کی اجازت دے دی تھی۔ان کے نزدیک کالج کا فنکشن بالکل بھوسا تھا، سارا وقت وہ دونوں پرفارمرز کی غلطیاں نکالتے رہے۔جہاں باقی لڑکے لڑکیاں اچھل کود رہے تھے جیسے سب کے پیروں میں سپرنگ لگے ہوں وہاں

یہ دونوں ایک کونے میں منہ پھلائے کھڑے تھے۔

وہ بار بار گھڑی کی جانب دیکھتا اور پھر نظر اٹھا کر ٹیکسی کے باہر جھانکنے لگتا۔ بارہ بج کر بیالیس منٹ......ٹرین دوپہر ایک بجے پلیٹ فارم چھوڑا کرتی ہے۔ اس نے سوچا، اکثر اوقات ایسا بھی ممکن کی حدود میں آجایا کرتا تھا کہ ٹرین ایک بجے سے پہلے پلیٹ فارم کی جان چھوڑ دے۔ یہ ریل گاڑیاں بھی نا، کتنی وقت کی ناپابند ہوتی ہیں۔ کبھی پہلے کھس جاتی ہیں تو کبھی بچارے مسافروں کو لمبی پٹڑی پر جھانک جھانک کر ان کے آثار دیکھنے پڑتے ہیں۔

''اس الو کی دم کو بولا بھی تھا کہ ہمیں دیر ہو سکتی ہے تم سیدھا سٹیشن چلے جانا لیکن نہیں۔'' روہت جھنجلا کر چنگھاڑا۔

''کیوں نہیں؟'' آنند کو کچھ ہنسی آئی روہت نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو اسے کھوں کھوں ،کھانسی آ گئی۔

''سالہ بولتا ہے کہ اس کے پاس تو بس میں کالج تک آنے کے بھی پیسے نہیں ہیں''

''اوئی! یہ کیا بات ہوئی؟ کالج میں تو وہ چپڑاسی سے بھی پہلے پہنچ جاتا ہے'' آنند نے سیٹ پر بازوں کا تکیا بنایا اور سر رکھا۔

''تمہیں چپڑاسی نے بتایا؟''

''نہیں میں ہی ہوں......تمہارا چپڑاسی'' آنند نے کہا اور وہ ہنسنے لگے، ٹیکسی ڈرائیور بھی ہنسنے لگا۔

''صاحب اب آگے کدھر کو جانا ہے؟'' ڈرائیور کہنے لگا۔

''یہاں سے دائیں لے لیں پھر اس کے بعد بائیں اور پھر گلی کا نکڑ آئے گا وہاں سے دوبارہ دائیں'' ٹیکسی والے نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گاڑی کا رخ بدل دیا۔ ایک چھوٹے سا بازار میں سے گزرنے کے بعد وہ آبادی میں گھس گئے۔ ویسے بازار اور آبادی ایک دوسرے کے اندر اندر ہی تھے، ایک دوسرے میں بغل گیر۔

آبادی کے ایک کونے میں تو رنڈیوں کا چکلا تھا۔ آنند نے دیکھا کہ پیشہ ور عورتیں بالکونی میں کھڑی نیچے چلنے والے چند مردوں کی غلیظ نگاوں کا جواب اشاروں سے دے رہی تھیں

......اوپر آ تو پھر بتاوں......تیری ماں کا!

دو تین جملے سنتے ہی آنند کا چہرہ لال ہو گیا اور گاڑی تیزی سے گزر گئی۔

☆☆☆

''اتنی مہنگی! کب خریدی؟'' ایک سوال جس کی وہ توقع کر چکی تھی۔ نمرہ آپا اس کی کلائی اپنی گرفت میں کیے بیٹھی تھیں۔ نیچے ہال میں نواز کسی نوکر کو ڈانٹ رہا تھا۔

''جی پرسوں خریدی...... جب مال گئی تھی گلشن کے ساتھ'' اجالا نے جھجک کر جواب دیا۔

''جب اگلی بار جانا تو مجھے بھی لے جانا میں بھی ایسی ہی خریدوں گی، یہاں سے رنگ دیکھو نا اور ......'' وہ بیچاری جسے اجالا اپنی آپا کہتی تھی ہر بار کوئی نئی خوبصورت چیز دیکھنے کے بعد یہی کہتی تھی البتہ سستی کے باعث کبھی کچھ خرید نہ پائیں، یہ اس کی شاید بچپن سے عادت رہی ہوگی جو جوانی اور جوانی سے نیم بڑھاپے میں زندگی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ پختہ سے پختہ ہوتی چلی گئی۔ تلخیاں اس کی زندگی میں بہت تھیں۔ صرف ہفتے بھر میں اس بیچاری کی دنیا کٹ کر صفر ہوگئی۔

سوموار کو شوہر جو فوج میں کوئی کیپٹن تھا، شہید ہوگیا۔ منگل کو اس کی ماں چل بسی، بدھ کو باپ بھی چل بسا اور جمعرات والی رات اس کی بہن کو طلاق ہوگئی اور وہ جمعہ کی نماز کے وقت اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لیے ان کے گھر آدھمکی۔ آخر وہ جاتی بھی تو کہاں جاتی اور نمرہ جو پہلے سے نڈھال تھیں اسے کہتی بھی تو کیا کہتی۔ انہیں خود سہارے کی ضرورت تھی، وہ کسی کو کیا سہارا دیتیں۔ اگلے ہی دن باپ لڑ بھڑ کر بچے کو لے گیا اور ہفتے کی شام کو اپنے بچے کی جدائی نہ برداشت کرتے ہوئے ماں نے چھت پر خودکشی کر لی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ نواز نے چھت پر چیلیں کووے منڈلاتے دیکھ لیے اور جب چھت پر سب پہنچے تو لاش کا منہ چیلوں کووں نے آدھا نوچ کر لہولہان کر دیا تھا۔

''آپ کو پسند آئی ہے تو آپ یہ لے لیں۔'' اجالا نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں نہیں یہ تم پہنو، تم پر جچتی ہے میں نئی لے لوں گی''

''کیا بات ہو رہی ہے؟'' ایک بوڑھی سی آواز کمرے میں گونجی ...... بڑی ماں۔

وہ اسی سالہ بوڑھی لاٹھی سہارے کھڑی تھی۔ اس کی کمر جھکی ہوئی مگر اس کی نگاہوں میں فخر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، نگاہیں اجالا کی کلائی پر اٹک چکی تھیں۔ اجالا نمرہ نے فوراً سلام کیا کیونکہ وہ برا مان جاتیں اگر کوئی چھوٹا سلام میں پہل نہ کرتا۔

''کچھ نہیں بس یہی گھڑی کی بات کر رہے تھے آپ آئیں نا'' نمرہ منمنائی۔ بڑی ماں دھیرے دھیرے اندر داخل ہوئیں۔

''تمہارے نئے کپڑے ککو کی ماں دے گئی ہے، میں نے نیچے رکھوا دیئے ہیں''

''نواز کے کپڑے بھی لانے تھی...... وہ نہیں دیئے''

''نہیں، ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی، میرے ہاتھ میں کپڑے تھماتی، اڑن چھو ہوگئی قطامہ!''

''کل آتی ہے تو خبر لیتی ہوں اسکی، ارے مہینہ ہونے کو ہو گیا پر درزی کے یہاں سے کوئی خیر خبر ہی نہیں، جو تاریخ دیتا ہے اس دن کمبخت دکان ہی بند ہوتی ہے'' نمرہ بھنائی۔

''ہی ہی......غی غی......غی غی'' بڑی ماں ہنس پڑی اور اجالا وہ بھی۔

بڑی ماں اصل میں دادی کہلائے جانے کی حقدار تھیں۔ ڈھیلا ڈھالا جوڑا پہن رکھا تھا جس پر الگ الگ پھولوں نقش تھے......

چنبیلی، گلاب، کنول، سنبل، گل لالہ اور گیندے کے پھول......عموماً بچوں کے کپڑے اسی طرح ہوتے ہیں لیکن کہتے بوڑھے بھی نفسیاتی طور پر بچے ہوتے ہیں۔ ان کی لاٹھی فرش پر بار بار ایک ''ٹھک'' کی آواز پیدا کرتی ہے جب جب وہ چلا کرتے ہیں۔ گھروں میں ایسی آواز کا اٹھنا ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس میں رہنے والے کے دل میں آواز آتی ہے کہ تم محفوظ ہو۔ اور اس سے فرق نہیں پڑتا کہ حقیقت میں وہ خود بھی محفوظ ہوں یا نہ ہوں۔ بڑی ماں جھولنے والی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

''کیا بات ہو رہی ہے؟'' اس بار ایک مردانہ آواز۔

''کچھ نہیں ہو رہا!'' بڑی ماں نے ٹکا سا جواب دے دیا اور وہ دروازے پر سے ہی پلٹ گیا۔

☆☆☆

موٹر سڑک پر تقریباً اڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس گاڑی کے چھوٹے پہیوں کو اتنی تیزی سے گھومتے دیکھ کر سڑک کنارے چلتے لوگوں کے دلوں میں یہ خوف سر اٹھاتا ہوگا کہ اس گاڑی کے پہیے ابھی باہر کی جانب نکل جائیں گے اور ایک بھیانک سا حادثہ رونما ہو جائے گا۔

......ڈرائیور آخر جتنا بھی کمال ہو لیکن جب تک گاڑی بھی کمال نہ ہوگی تو سفر بھی کمال نہ ہوگا۔ خدا چاہے جتنا بھی کمال ہو جب تک انسان کمال نہیں ہوگا......سجدے بھی کمال نہیں ہوں گے......

گاڑی ایک لڑکے کے سامنے رکی جو سیاہ چشمہ لگائے کھڑا تھا۔ تیز روشنی اس کی استری شدہ نیلی شرٹ میں خوبصورتی کی ایک اور تہہ گاڑھ رہی تھی اور اس کے ماتھے پسینے کے بے تحاشا قطرے جمع ہو چکے تھے۔ ہاتھ میں ایک چمڑے کا بیگ تھا۔ موٹر کا دروازہ کھلا اور وہ تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

''چلیں جی!'' اس لڑکے نے بیٹھتے ہی ڈرائیور سے کہا۔ ڈرائیور بڑی عمروں کا تھا، جس کو دیکھنے پر لگتا جیسے اس نے پچھلے چند ہفتوں سے شیو نہیں بنائی۔ ٹیکسی پھر سے سڑک پر پہلے جیسی دوڑنے لگی۔ آج اس روڈ پر ٹریفک کسی وجہ سے بہت کم تھی۔

''دیر کر دی تم دونوں نے! دیکھو اب تمہاری وجہ سے گاڑی نہ چھوٹ جائے، خیال کیا کرو اور وقت کی پابندی بھی، میں پچھلے پندرہ منٹوں سے وہاں کھڑا تھا'' اس لڑکے نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے

تیز تیز کہہ ڈالا۔

''تمہیں بولا تو تھا کہ تم سیدھا وہیں چلے جاتے تو کتنی آسانی ہو جاتی!'' روہت نے احتجاج کیا اس کی بات سن کر۔

فرنٹ سیٹ پر بیٹھا آنند مڑ کر کہنے لگا: ''اے وجے سنو...... وقت کیا ہو گیا ہے؟'' وجے نے چڑ کر منہ پھیر لیا۔ اس کی کلائی پر خوبصورت سی گھڑی بندھی تھی...... لیکن...... لیکن وہ چلتی نہیں تھی، دو سال ہوئے بند ہو گئی، جڑوانے کی بہت کوشش کر مگر نہیں جڑی، اب وہ ایسے ہی بند گھڑی پہنے پھرتا ہے اور روہت آنند اور باقی دوست اسے چھیڑتے ہیں اسی ایک بات پر۔ روہت ہنس پڑا اور آنند کی کلائی کی جانب نگاہ دوڑائی۔

...... بارہ بج کر باون منٹ...... صرف آٹھ منٹ باقی ہیں!

''بھائی صاحب، تھوڑا تیز چلائیں'' آنند نے ڈرائیور سے کہا۔ ٹرین اگر ایک کے بعد ہی پہنچے تو کتنا اچھا ہوگا، آنند نے سوچا۔ ان سب کی آج پہلی بار خواہش تھی کہ ٹرین لیٹ ہو جائے۔ ڈرائیور نے زور زور سے آنکھیں جھپکائیں اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ وہ ڈرائیور کسی قدر ٹھنڈے مزاج کا آدمی معلوم ہوتا تھا، موٹر چلاتے ہوئے کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کو ڈرائیوری کرنے کے لیے ہی جنا گیا ہے۔ وجے اور روہت کسی بات پر الجھنے لگے اور آنند یہ سوچنے لگا کہ کاش وہ نہ جانے کا فیصلہ کرتا۔ پر کسی بیرونی قوت کے اثر میں آ کر اس کے زبان کو تالے ڈل گئے...... اسے لگا جیسے لاہور چیخ چیخ کر اسے بلا رہا ہو...... جیسے لاہور میں کوئی خاص بسنے والے اسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

وہ جب سٹیشن پہنچے تو پتہ چلا، ٹرین لیٹ ہے۔ ٹکٹ خریدا اور دس منٹ بعد ٹرین بھی آ گئی۔ وہ جس ڈبے میں تھے وہاں ان کے ساتھ موجود لوگوں میں دو آدمی ایسے تھے جن کی شکل ایک دوسرے سے بہت ملتی تھی۔ کہنے کو ایک اندھا بھی بتا سکتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ سیاہ رنگت، چھوٹی داڑھی جسے کبھی شیو نہیں کیا گیا تھا، کلائی پر کوئی سستی سی گھڑی اور سرمئی نفیس کپڑوں پر کوئی بھونڈا سا عطر...... اور ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے وہ اس ٹرین میں اکیلے ہوں یا کوئی انہیں دیکھ نہ سکتا ہو۔

دونوں بھائی...... آپ میاں صوبے دار، گھر میں بیوی جھانکے بھاڑ......

دونوں میں جو اکڑ تھی، کوئی بتا نہ سکتا تھا کہ یہ شاخِ زعفران کیوں اور کیسے لگی ہے......

''میں نے تو کہا تھا مگر ابا نہیں مانے، وہ رشتہ مانیں نہ مانیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا'' بڑا بھائی تو آپ ہی آپ بولے جا رہا تھا۔ بالکل دوسرے کی طرح۔

آدھا سفر دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے رہے...... بحثیں ہوئیں کہ کیوں اور

کیسے ان کے گاؤں کا لڑکا ''شعلہ'' کسی شہری لڑکی ''کرنٹ'' کے چنگل میں پھنس کر برباد ہو گیا، کیسے بلو اور تتلی کی شادی میں تایا دھویں نے ٹانگ اڑا دی تھی مگر جب تتلی نے خودکشی کی اور بلو نے تایا کو کوٹنے کی دھمکی دی تو وہ کیسے بالکل پھیکے پڑ گئے تھے...... بس کچھ ایسی ہی فضول باتیں ہوتی رہیں جن کا مقصد فقط آپا دھاپی تھا۔ آنند سوچنے لگا کہ وہ کہاں آ پھنسا۔ ایسے آتش زیرِ پا رہنے سے اچھا نہیں کہ وہ ٹرین سے کود جائے!

کافی دیر گزر گئی، سب خاموش ہو گئے مگر گاڑی کی کھٹ کھٹ بدستور جاری تھی۔

''وجے......'' گاڑی کی کھٹ کھٹ کے ساتھ اس نے سرگوشی کی۔

وجے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کتنے دنوں سے سہی طور پر نہ سونے کی وجہ سے...... اب اس وقت اسے بے تحاشا نیند آنے لگی تھی۔ اپنی ڈبڈباتی ہوئی سرخ سرخ آنکھوں سے اس نے باقی مسافروں کی طرف دیکھا۔ سب سو رہے تھے۔ کھڑکی میں سے سورج کی کرنیں آ رہی تھیں اور باہر سرسوں کے کھیت نظر آ رہے تھے۔ ان سرسوں کے کھیتوں کے پار کسی ولی کا روضہ اپنا بڑا سا گنبد لیے کھڑا تھا...... جہاں انہیں رکنا تھا، وہ میر پور سٹیشن تھا...... بہت چھوٹا سا سٹیشن۔ گاڑی نصف دو منٹ سے زیادہ نہ ٹھہرتی۔

''وجے!''

''ہاں کیا ہے؟'' وجے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''میر پور سٹیشن پر رکنا ہے ٹھیک ہے، شام سے پہلے پہنچ جائیں گے''

''ارے کیوں گھبراتے ہو دوست، رک جائیں گے جہاں کہو گے، میر پور سٹیشن پہ رکنے کا کہو گے تو وہاں بھی رک جائیں گے پر ایک بات بتاؤ، تمہارا گھر تو لاہور میں تھا نا، یہ تبدیلی کب لائی؟'' سورج کی کرنوں سے وجے کا چہرہ دمک رہا تھا۔

''میر پور لاہور کے پاس ہی ہے، ان کھیتوں کے بعد دو تین اور شہر آئیں گے، پھر میر پور آئے گا، داخل ہوتے ہوئے تم زمین کا روکھا پن محسوس کر لو گے، لیکن زمین زرخیز بہت ہے'' آنند نے رک رک کر کہا۔ اس نے دیکھا کہ وجے کے ہونٹ ہلکے نیلے ہو رہے تھے اور اس کی ہلکی مونچھیں ناک سے نکلنے والے شربت میں ڈوبنے لگی تھیں۔ حالات قابو میں کرنے کے لیے اس کی ناک نے شوں سے سب کچھ اوپر کھینچ لیا۔

اچانک ٹرین کے پاس والے ڈبے سے شور و غوغا کی آوازیں اٹھیں۔ کوئی ٹکٹوں کا بکھیڑا پڑا تھا جو دو منٹوں میں حل ہو گیا۔ اس نے سامنے بیٹھے دونوں بھائیوں کے ماتھوں پر بکھری سلوٹیں دیکھ کر یہ سوچتے ہوئے آنکھیں بھینچ لیں کہ پتہ نہیں انہوں نے کیا روگ پال رکھے ہیں......

☆☆☆

عام سی شام تھی لیکن چاند بادلوں کا بُکل مارے بیٹھا تھا۔ اس چاند کے پاس...... کوئی درجن تارے تھے جنہیں

دیکھ کر لگتا کہ کسی ماہر نقاش نے برش سے آسمان کے تاریک کاغذ پر نقش کیے ہیں۔

بڑی ماں لکڑی ٹیکتے ہوئے لان میں قمقموں کے بیچ گھوم پھر رہی تھیں اور اندر بیٹھے نمرہ اور اجالا کھانا کھانے لگے تھے۔ٹیبل پر بڑی ماں کی کرسی خالی تھی اور سامنے پڑی چورن سفوف کی ڈبیا بند پڑی تھی۔ نواز کسی ملازمہ سے جھک جھک کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔

بڑی ماں کو بھی ایسا ہی لگ رہا تھا جیسا بہت سے انسانوں کو زندگی کے بعض موڑوں پر محسوس ہوتا ہے یعنی......احساس......کہ زندگی اپنی کتنی تتر بتر ہے......کتنی منتشر ہے، کتنی پریشان ہے......کہ زندگی اپنی کتنی خستہ ہے کتنی بُھر بُھری ہے......بس ایک ہی جگہ مرتے دم تک بیٹھے رہ جانے کا جی چاہتا ہے پر یہ خیال جب آئے کہ بگڑا وقت بھی گزر ہی جاتا ہے تو دل کو بڑا سکون ملتا ہے۔

وہ سوچنے لگیں کہ نواز کو اسکی ماں نے لاڈ سے بگاڑا ہے، خاور میاں کو ماں باپ کی دوری نے اور اجالا کو......اجالا کو اس کے شوہر نے اپنے بیگانہ پن سے......

''ارے واہ بھئی! نیا مسالہ تو کمال ہے، کیا خوب کھانا پکا ہے اس میں، واہ!'' نمرہ نے زبان چٹخا کر کھانے کی تعریف کی اور پھر دریچے سے باہر لان میں گھورنے لگیں۔نہ جانے کیا دیکھنے لگیں۔

''نہیں امی مسالہ نہیں، یہ تو ان کے ہاتھوں کمال ہے، ایسے ہاتھ ہیں جو مٹی کو بھی چھوئیں تو سونا بن جاتی ہے، مسالوں میں کہاں دم ہوتا ہے'' نواز ایک دم بے شرم انداز میں بولا اور اجالا کے قدم دروازے کی طرف بڑھے مگر نواز نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ بچ کر نکل گئی۔اس کے ہاتھ سنہرے دبے میں سے پھسل کر رہ گئے۔

نواز کو اجالا پر بڑا فخر تھا، حالاں کہ وہ اسکی بھابی تھی پر اس کی نگاہیں مستقبل کے رشتوں پر گڑھی تھیں......نواز کا فخر بس ''بگانی کھیتی پر جھینگر ناچے'' کا مفہوم تھا۔

نمرہ پلٹ کر منمنائی: ''بڑی ماں کے معدے کا مسئلہ مٹانا کتنا کٹھن ہو گیا ہے، یہ چورن سفوف کی ڈبیاں بھی جو پہلے کام کیا کرتی تھیں اب کام کرنا چھوڑ گئیں ہیں، معلوم نہیں انہیں کیا ہو گیا ہے!''

''یہ بڑھاپا زندگی کی دوڑ کو دوا کرتا ہے پر اس کے بدلے جسم کو کافی درد بھی دیتا ہے......یہ درد دوا کافی پیچیدہ ہے......عمر لمبی ہو جائے تو یہ دوا پینی ہی پڑتی ہے میری ماں، تم بھی جلد ہی پیو گی دیکھنا، خی غی......غی خی''۔نواز کھسیانی ہنسی ہنسا۔

''غم کے ماروں کو تو بڑھاپا بھی نصیب نہیں ہوتا......ان کا کیا؟''

''غم کے مارے......ہائے......ہائے! غم کے ماروں کو تو زندگی ہی نصیب نہیں ہوتی ماں''

''تمہیں کیا غم ہے؟ بولو، جواب دو'' نمرہ چمچ رکھ کر آگے جھک گئی۔

''ہنھ غم، ہاں...... ہاں جس لڑکی سے میں پیار کرتا ہوں، اس کی شادی ہو چکی ہے...... بس یہی غم ہے پر یہ غم میرے لیے بہت بڑا ہے، میں اس کے ساتھ زیادہ نہیں جی پاؤں گا ماں''

''دوسری لڑکیاں بھی ہیں نا، اپنی توجہ بدلو تو یہ گھاؤ بھر جائے گا، میں کیا کہتی ہوں یہ اجالا کی دوست ہے نا...... گلشن!...... مجھے بہت پسند ہے، کیسی لگتی ہے تمہیں؟''

''گلشن نا نہیں، وہ میری حالت بالکل بکوٹ ڈالے گی، ہاہاہا'' نواز کرسی دھکیلتا ہوا چلا گیا۔ بڑی ماں نے اندر گھستے ہوئے ایک دو بات سن لی تھی۔ سنتے ہی ان کے ذہن میں جھماکے کے ساتھ پینسٹھ برس پرانی یادیں تازہ ہو گئیں، تصویروں کی پٹی چلی...... وہ پندرہ سالہ لڑکی ہے۔ درخت کی نیچے پینگ جھول رہی ہے اور بہن دوڑتی ہوئی آئی اور چلا کر اعلان کیا شادی کا فیصلہ ہو گیا ہے، اسے سنتے ہی کیسے چہرے کی سرخی بڑھی اور وہ ہنسی شرماتی ہوئی اپنی دادی کی پلنگڑی پر جا کر ڈھیر ہو گئی ہے۔ اور دل کی دھڑکنیں آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں، میری شادی کا فیصلہ کر لیا بابو جی نے، انہوں نے دس دفعہ خوش اور اداس ہو کر اپنے آپ سے کہا تھا۔

بڑی ماں ٹیبل پر پڑی چورن سفوف کی ڈبیا اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھوں میں لے کر کھولنے لگیں اور غمگین بیٹھی نمرہ کے دل میں پیوند گانٹھنے لگیں۔ نواز اونچی آواز میں اپنی پسندیدہ فارسی غزل سننے لگا، جب سے اس نے فارسی سیکھی تھی تب سے یہ جملے اس کے من کو بھا گئے تھے....

تا تو بمن می رسی، من بخدا می رسم

(جب تک تو میرے پاس پہنچے گا میں خدا کے پاس پہنچ جاوں گا، یعنی مر جاوں گا)

پے در پے بڑی ماں کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں پانی کے ننھے قطرے امنڈنے لگے تھے۔

☆☆☆

''فون آیا تھا اس کا، تمہارا پوچھ رہا تھا، تم بات کیوں نہیں کرتی بیچارے سے؟ اتنا نہ ترسایا کرو'' نمرہ آپا اس کی شفاف آنکھوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کی روح دیکھ رہی تھی۔

''ہر بار اتفاق سے اسی وقت گھنٹی آتی ہے جب میں نہیں ہوتی''۔ اجالا نے جھوٹ بولا۔ وہ موجود ہوتی تھی ہر بار۔ ٹیلی فون کی گھنٹی کانوں میں پڑتی تو جان بوجھ کر ادھر ادھر گھسک جاتی۔ یہاں ٹیلی فون بجا اور چادر اوڑھ کر گہری نیند میں ہونے کی اداکاری کرنے لگی۔ یہاں ٹیلی فون بجا اور وہ نہانے چلی گئی۔ یہاں ٹیلی فون بجا اور وہ گلا خراب ہے کا بہانا اڑا کر آپا کو ٹال گئی۔ کیوں ٹالتی تھی اور کیوں کتراتی تھی؟۔ اس کا جواب پیچیدہ نہیں۔

ہر نازک پھول جھڑی لڑکی کو جب اس کا میاں مہینوں مہینوں یاد نہیں کرتا تو وہ اسی طرح ناراض ہوتی ہے۔ آخر

فوج کی ڈیوٹی، ڈیوٹی نہ ہوئی بس بیوی بھولنے کا بہانہ بن گیا۔ پچھلے دو سالوں میں خاور میاں کے بس پانچ ٹیلیفون اور ایک چٹھی آئی۔ اور وہ بھی بڑی ماں کے نام تھی۔ لکھا تھا کہ ان کے ڈاکٹر نے یہ کہا ہے کہ ٹانگوں کی جو ٹیوب دی تھی اس کی مالش جاری رکھی جائے اور بس۔

''ویسے کیا بات کی؟'' اجالا نے ابرو اچکا کر پوچھا اس امید سے کہ اس کی کوئی خبر ہی لے رہتی۔

''یہ کہہ رہا تھا کہ میں آ رہا ہوں لاہور کافی عرصہ رہوں گا، یہ کیا تجھے خوشی نہیں ہوئی سن کر؟'' اس نے اجالا کے چہرے کی جانب دیکھ کر کہا جس کا رنگ بدل رہا تھا مگر وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی...... جو ہو سو ہو، مجھے کیا پروا...... پر حقیقت میں تھی پروا...... جب وہ آئے گا تو جذبات کی کچہری لگے گی، سنوائی ہوگی اور ہر حال میں مجرم کو سزا نصیب ہوگی۔

''اچھا وہ تم نے...... مس راجیشوری کا نام سنا ہے......''

''نہیں...... وہ تو نہیں جو اس دن گھر بھی آئی تھیں اپنی دوستوں کے ساتھ''

''ہاں وہی ہیں وہی ہیں، میں سویرے ان کے گھر جاوں گی، بیچاری کا بیٹا مرڈر ہو گیا ہے، کافی ینگ ڈاکٹر تھا...... نام یاد نہیں آ رہا بتایا تو تھا انہوں نے...... ڈاکٹر؟'' نمرہ نے کچھوے کی رفتار سے کہا اور اپنی کہنی کھجلانے لگی۔

''ڈاکٹر راجندر؟''

''ہاں.... بیچارے... تم سے پوچھ رہی تھی چلو گی میرے ساتھ؟''

اجالا کچھ سوچنے لگی پھر نظر اٹھا کر کچی کلی کی طرح بولی: ''جی چلوں گی'' نمرہ کے جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا، گزرتے ہوئے اس کی نظر آئینے پر پڑ گئی۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنی آنکھیں دیکھنے لگی۔ وہ بڑی بڑی ہلکی نیلی آنکھیں جن میں نہ ہونے کے برابر سرما تھا لیکن وہ تھیں کتنی سندر۔

''کتنی سندر آنکھیں ہیں تمہاری'' خاور نے پہلی رات پہلی اور آخری بار کہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں دیکھتے ہوئے مسکرا دی اور یہ ٹھان لیا کہ وہ اب کچے دھاگے میں نہیں بندھے گی۔

☆☆☆

آسمان کی سیاہ چادر پر چھوٹے چھوٹے موتی پھوٹنے کی کد و کاوش کر رہے تھے۔ ٹرین کی کھٹا کھٹ متواتر جاری تھی اور وہ ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ ریل گاڑی نے چیخ ماری اور وجے کی آنکھ کھل گئی۔ نیند کے مارے پپوٹے میلے کچیلے ڈبے میں دوڑنے بھاگنے لگے۔ کونے میں روہت سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ اس کی نظریں پلٹا کھا کر آسمان کی طرف اٹھیں۔ وہ دودھیا ستاروں کو تکنے لگا...... شام سے پہلے پہنچ جائیں آنند نے بولا تھا مگر اب تو رات ہو رہی ہے...... ایک چھناکے سے اسے یاد آیا اور وہ ہڑبڑا کر آنند کی طرف لپکا۔ اس نے

آنند کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''آنند اٹھو، آنند!'' وہ نہ اٹھا مگر دونوں بھائی جاگ گئے اور اسے طرار فرار نگاہوں سے تکنے لگے۔

''کیا ہوا؟ پہنچ گئے وجئے؟ کیا کیا'' اس نے جب باہر دیکھا تو اس کے ہونٹ لٹک گئے۔ وہ بگٹٹ بھاگتا ہوا ٹی ٹی کی طرف بڑھ گیا۔

''اب کیا ہوگا، ارے رکو میں بھی آتا ہوں'' وجئے نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ڈبے رنگ برنگے لوگوں سے بھرے پڑے تھے۔ چند بچوں جو بیٹھے مونگ پھلی کھا رہے تھے آنند کو دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے جیسے کوئی ہوّا دیکھ لیا ہو۔ اتفاق سے ٹی ٹی پاس ہی تھا۔ بالکل بدوضع سا آدمی، چھیلی ہوئی موم بتی ، چنچل لڑکیوں کی ادا لیے کھڑا تھا۔

''سنیں!'' آنند بولا اور ٹی ٹی نے خوب سن لیا تھا مگر اپنا طرہ جمانے کے لیے ان سنا کرتے ہوئے بیڑی پیتا رہا۔ آنند پھر بولا: ''سنیں......کیا میرپور سٹیشن گزر گیا؟''

''ہنوں ہنوں......چار شٹیشن پہلے ہی گزر گیا ہے!'' ٹی ٹی نے اپنے طعنہ آمیز لہجے میں کہا اور دوبارہ بیڑی پینے لگا۔ اس نے اگلے سٹیشن کے بارے میں پوچھا۔

''لاہور شٹیشن......نصف گھنٹہ مزید لگے گا، چپ کر کے بیٹھ جاو وہاں''

☆☆☆

گھنٹے بعد وہ تینوں لاہور کی ایک سڑک پہ کھڑے تھے۔ اس شام آسمان دھند کی شکل میں زہر اگل رہا تھا پر لوگ اس کو نظر انداز کرتے چلے جا رہے تھے۔ پان اور سگریٹیں پر وہ خاصے روپے خرچ چکے تھے۔ روڑ کی دوسری طرف زیب وزینت کی بہت سی دکانیں تھیں۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے ان غمگین دبلی پتلی لڑکیوں کی چھوٹی سی ٹولی کو دیکھنے لگا جو کسی دکانوں کی طرف دیکھتی جا رہی تھیں، لڑکیوں کے بیچ میں اک ہم عمر لڑکا تھا جسے دیکھ کر وجئے نے بے اختیار کہا: ''زہے نصیب، زہے نصیب'' اور آنند کھلکھلا اٹھا۔

وہ سگریٹ کو زیروزبر کرنے لگا......ایک کش اندر......اور دھواں باہر، ٹھنڈی ہوا دھویں کو لے گئی ......ایک کش اندر اور دھواں باہر......ایک بہت بڑا کش اندر......اور بے تحاشا دھواں باہر......ایک اور بڑا سا کش اندر......اور روہت نے اس کے منہ سے سگریٹ اور دھواں نکال کر دور پانی کے ٹکڑے میں پھینک دیا۔ آنند مزے سے اس کی بوکھلاہٹ دیکھنے لگا۔ بدصورت سے ماتھے پر اتنی ٹھنڈ میں بھی پسینے کی بوندیں جھلمل کر رہی تھیں اور اس کی لکنت بھری زبان بار بار وجئے کو سہی سے روپے گننے کا کہہ رہی تھی۔ روپے تھے نہایت کم۔ وجئے تیسری بار روپے گننے لگا: ''ایک......ایک......دو......''

چند سکے دیکھ کر اس کا منہ لٹک گیا، لیکن یک دم ذہن میں کوئی خیال آیا اور آنند نے ذرا فاصلے

سے آتے تانگے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ تانگہ رکا۔

''شاہد مال کتنے فاصلے پر ہے؟'' آنند نے پوچھا۔

''پاس ہی ہے بس اس سامنے والی چوک سے ہے کوئی دس منٹ کا فاصلہ''

وہ چڑھ گئے تانگے پر اور تانگہ لاہور کی سڑک پر بھاگنے دوڑنے لگا۔ منزل پر پہنچ کر آنند نے تانگے والے کو دام دیئے، بیچارے نے بہت کم دام لیے۔ وہ جگہ شہر کی بھیڑ بھاڑ سے ذرا ہٹ کر تھی۔ اندھیرا تھا گلیوں میں۔ جگہ جگہ کتے گشت مار رہے تھے۔ کوئی کسی دوسرے پر بھونک رہا تھا اور کوئی ایسے بھی تھے جو اپنے آپ پر بھونک رہے تھے۔ سامنے دو منزلہ عمارت تھی۔ اوپر کی منزل کے دریچوں میں سے لالٹین کی روشنی آ رہی تھی۔

''ارے یہ تو بتادو کس کے پاس لے کے جا رہے ہو ہمیں؟'' وجےئ نے آخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

''میرے ابا کا جاننے والا ہے مگر...... میرے ابا نے قرض لیا تھا جب وہ یہاں رہتے تھے، کافی عرصہ پہلے کی بات ہے، مجھے ڈر ہے ابا نے اس کا قرضہ واپس نہیں کیا تھا، چلو دیکھتے ہیں'' لحظہ بھر بعد وہ زینوں پہ چڑھ گئے۔

اس آدمی یعنی ''مٹر چاچا'' کو آنند نے دو تین بار ہی دیکھا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے مٹر چاچا کیوں کہتے ہیں، سنی سنائی تھی کہ ان کو مٹر بے حد مقبول تھے اس لیے ان کا نام مٹر چاچا پڑ گیا اور دو ایک باتیں تھیں جیسے...... زندگی بہت بھاری ہے ان کی، اس لیے زندگی سے خفا رہتا ہیں...... ''میرا خون چوس گئے'' ہانکتی سوکلو کی بیوی اس کی زندگی درہم برہم کر کے چلی گئی تھی، بال بچہ کوئی نہ تھا۔

''تمہارے ابا اگر تمہارے جیسے نہ ہوئے تو ضرور قرضہ واپس کر دیا ہوگا'' وجےئ کی بات سن کر روہت ہنس پڑا۔ چوتھے دروازے کے سامنے آنند نے قدم روکے اور کھٹکھٹایا۔ دروازے کے پار کھسر پھسر کی آوازیں آئی۔ ساتھی کمرہ کسی مراسی کا ہوگا، ہارمونیم کی آواز گونج رہی تھی۔ چالیس پینتالیس کا آدمی بنیان پہنے دروازے سے نکلا۔ چھوٹی سی کسی ہوئی توند اور ژولیدگی سے بھری آنکھیں جو جاگنے کے باعث عجیب عجیب سی ہو رہی تھیں۔ آنند نے بات بیان کی خالص بھونڈے انداز میں......

''تماری بات کی مجے کچھ سمجھ نہیں آئی، پھر سے کہنا کیا کہا؟'' مٹر چاچا نے الفاظ چبا کر نہایت ہی خشم ناک انداز میں کہا۔

''جی......'' آنند کا منہ اتنا سا نکل آیا۔ آنند کے باپ نے قرضہ نہیں لوٹایا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اس کو سات پانچ کر لے گا۔ مگر اس نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں، ان سات پانچ حربوں کو

خوب جانتا تھا۔

''او جی کے بچے، مجے بتاو میں کیا کرو؟۔ مجھ کو قرضہ واپس نہیں ملا، سو روپے کا...... کتنے روپے کا؟ سو روپے کا! تمہارا میں کیا کروں؟ تم تینوں کی ملا کر قیمت بیس روپے سے زیادہ نہیں ہو گی!''۔ وہ بنیان پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''معاف کرنا...... دس روپے!...... دس روپے سے زیادہ نہیں ہو گی...... دو روپے اس لمبو کے (وجئے) جو سوٹ کیس اٹھائے کھڑا ہے پیچھے اور سات روپے اس سفید شرٹ پتلون والے کے (آنند)، اور! تمہیں تو میں فری میں بھی نہیں لیتا......'' وہ روہت پر جنگھاڑا اور روہت اپنا چھوٹا منہ چھپاتا واپس آندھیرے میں دیکھنے لگا۔

آنند نے کافی منت سماجت کی، اور وہ مان گیا۔ بنیان پر انگلی پھیر کر اس نے کچھ سوچا اور بات کی: ''ٹھیک ہے، مگر مری اک شرت ہے''

وجئے جلدی سے بول پڑا: ''شرط جو بھی ہو منظور ہے!''

ان کے چہرے پر تھوڑی طنزیا مسکراہٹ نمودار ہوئی، کہنے لگے: ''تم تینوں میں سے دو کو میں رکھ سکتا ہوں، تیسرے کی جگہ نہیں، اس کو جمشید کے پاس سونا پڑے گا''

''وہ کون؟'' روہت منمنایا۔

''وہ دیکھو!''۔ وہاں ایک لمبا تڑنگا کالا آدمی روٹیاں لے کر جا رہا تھا۔ اتنی سردی میں اس نے بھی بنیان پہن رکھی تھی۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر آنند اور وجئے اور وہ بوڑھا روہت کی طرف دیکھنے لگے۔

''ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں' روہت نے بے دلی سے کہا اور پلٹا۔ وہ دونوں اس بوڑھے کے پیچھے اندر داخل ہو گئے۔ اندر ریڈیو چل رہا تھا، جو اس نے بند کر دیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔ چارپائی پہ لیٹتے ہی آنند کی نظریں گیلی چھت سے ٹکرائیں...... لالٹین بجھی، اندھیرا چھایا اور اس کی آنکھیں بند......

☆☆☆

''میری طبعیت ٹھیک نہیں تم لوگ جاؤ' وجئے نے ترِاہ ترِاہ کر واویلا مچایا تھا لیکن وہ پھر بھی اس کو گھسیٹتے ہوئے بنگلے تک لے گئے تھے۔ باہر موٹروں کا تانتا بندھا تھا۔ نئ سے نئ قسم کی موٹریں۔ وہ چند آدمیوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ بنگلہ تھا بڑا خوبصورت...... ہر طرف سلسلہ وار گملے رکھے ہیں، درجہ بہ درجہ نوکر چائے کی پیالیاں لیے اندر باہر نکل رہے ہیں اور پاس ہی بڑا سا لان ہے اور اس بڑے سے لان میں درجن

بھر گورے بیٹھے سگار پی رہے ہیں لیکن ان کی کرسیوں کا کوئی ڈھنگ نہیں، پہلی کا منہ چوتھی کی طرف ہے اور چوتھی کا دسویں کی طرف، دوسری کا چوتھی کی طرف اور آٹھویں کا دیوار کی طرف جس پر انگور کی ترچھی ترچھی بیلیں رینگ رہی ہیں، یہ بانکی بیلیں باقی بنگلے کی اس ترتیب اس ڈھنگ میں کافی بڑا شگاف ڈال رہی ہیں۔

''Hello! Come here Rohit! Rohit!'' اچانک ایک گورا انہیں دیکھتے ہی چلا اٹھا لیکن جیسے ہی انہوں نے اسے نظر انداز کیا تو وہ گورا غصے سے تربُھر ہو گیا اور اپنے ساتھیوں سے کچھ بھنبھنانے لگا۔ آنند نے دیکھا کہ روہت بہت بے چین کھڑا ہے، اپنی کف پہ کی گئی ناقص سلائی کو اپنے چھوٹے چھوٹے ناخنوں سے مزید کھریدنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی وقت ایک لڑکی ان کے پاس آئی اور کہنے لگی: ''ارے آپ؟ آپ روہت ہیں!؟'' روہت کا منہ بھینس جتنا کھل گیا۔

''جی، لیکن'' روہت کا لاجواب پا کر وجئے نے بات کی۔

''آپ میرے ساتھ چلیں بڑی بے صبری سے آپ کا انتظار ہو رہا تھا'' وہ چہک کر بولی لیکن کچھ سوچ کر بجھ گئی۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں اچانک سے اداسی کی لہریں ٹھاٹیں مارنے لگیں۔

''Hey!! Rohit!! Here!'' اسی گورے کی آواز پھر کہیں پاتال سے نکل کر آئی۔

روہت پس و پیش جذبات لیے ان کی طرف بڑھنے لگا اور آنند اس کے پیچھے جانے ہی لگا تھا کہ لڑکی نے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اور وجئے بیچ میں سوچتا رہ گیا کہ کس کے پیچھے جائے۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے اور اسے محسوس ہوا کہ گزرے دن اتنے بے قرار کیوں تھے۔ خیالِ پیار اور چمکتے ہوئے گال۔ پتہ نہیں اس وقت آنکھوں میں اشک کیوں نہیں آتا...... جب پہلی بار انجام کا خیال ہی دماغ میں نہیں آتا۔ سمجھ آ جاتی ہے کہ کیوں کچھ چیزیں حد سے زیادہ اہم ہو جاتی ہیں۔ آنکھوں میں لکھا تھا کہ...... تمہارے سوا یہ دنیا سنسان ہے، بے اشک نگاہیں اور وہ دل تھا کہ سمجھا...... ہوش تمہارے بنا بیکار ہے۔

روشنی جو ہر طرف تھی، سیاہ چادروں میں بدل رہی تھی اور آسمان سے پھول اتر رہے تھے جیسے پھولوں کی بارش ہو...... پھول گل شمس و قمر سارے ہی ٹوٹ کہ سپنا بن گئے...... وہموں کا شور تھا!...... مگر سارے ہی ٹوٹ کہ اپنا بن گئے۔ اس کی نگاہیں سیاہ و سفید پہ رکی تھیں اور آنکھیں دل چیرتی ہوئیں جگر بوس ہو گئیں، وہ تاب نہ لائی اور چپکے سے شرمائی۔ لحظہ بھر مزید اور جو کوئی خوف بچا تھا وہ بھی رخصت ہو گیا...... شاید...... شاید ذمہ داریاں بیچ میں آتیں مگر کس ڈھب میں پہلے کے لیے دوسرا کمال علفت ہو گیا۔

بیماری ایسی ہے یہ عشق کہ دوا و درماں کچھ کام نہیں آتیں۔ فُرج درد بھی ہے ایک دوا...... مگر ایسی

دوائیں تو ہزار بار پہ بھی کام نہیں آتیں............

متواتر گر رہے تھے پھول......دودھ جیسی چنبیلی......خون جیسا گلاب......کاسنی کنول......سنبل سبز، گل لالہ اور گیندے کے سنہرے پھول............

بے فکرِ انجام کی روشنی کڑک کر پیالوں میں گری اور شراب کا گھونٹ سمجھ کر دونوں نے اسے پی لیا......

کوئی آواز آ رہی ہے......کوئی دور سے چلا رہا ہے......آوازیں بڑھ رہی ہیں اور شور بڑھ رہا ہے۔

''محبت روگ ہے''......''محبت بلا ہے''......''جنس ناروا ہے''......''دو عالم فراموش ہے''

......''اس سے دولخت ہوتی ہے دوپارہ ہوتی ہے قسمت''

......پھٹے کاغذ جو سارے جہان میں بکھرے، کہیں یہ بھی پھٹے......کہیں یہ بھی بکھرے!

آنکھوں کے قمقمے ایک دوسرے پہ ٹکے رہے اور کتنی دیر ٹکے رہے!

☆☆☆

دوسرا باب

......تاریکیاں......

وجے نے باغ سے گزرتے ہوئے جو گلاب چرایا تھا اس سے ایک پتی الگ کر کے اس کے ٹکڑے کرنے لگا۔ گذشتہ گھنٹے کے نظارے کی پرزے اچھل اچھل کر اس کے تخیل میں داخل ہوتے اور اپنی مستقل جگہ پا جاتے۔ وہ سڑک پر مہمل پھرنے لگا۔ چجی تُلی حقیقتیں دل پہ لگی ضرب سے اٹھ رہی تھیں اور وہ اپنے آپ سے بولا؛

"آخر اس دل پر کس کا زور چلتا ہے......آئینہ آنند......آنند یہ وہ آئینہ ہے جو کسی کے قابو میں نہیں، اس پر تو بس جذبات کا ہی رنگ چڑھتا ہے، جس پہ تمہارا دل......اسی پہ میرا دل بھی مرتا ہے......

یہ!......یہ ٹسوے نہیں دنیا......یہ سچ مچ کے آنسو جو میرے گالوں پر لڑھک رہے ہیں......یہ......یہ اس انجام کے نہیں جو ہوا ہی نہیں......یہ اس ابتدا کے ہیں جو ابھی جمی ہی نہیں......تم ہو بے بس آنند......

ہوں، ہوں، ہاہا......آنند میں بھی بے بس ہوں!......لیکن میں اب بتا تا ہوں میں کروں گا کیا

......اگر مجھے دوا نہ ملی تو......تو میں تمہیں چوٹ دوں گا اور تمہارے گرم خون سے اپنے زخم سینکوں گا، کیونکہ کیونکہ پیار اور جنگ میں سب! ہاہاہا! کیونکہ جنگ اور پیار میں جائز ہے سب کچھ سوائے بازی کے بعد جینے کے......جنگ لڑو تو یا تو جیت جاو یا میدان میں ہی مارے جاو......پیار کرو......تو یا تو پالو............

یا پاتے پاتے مرجاو!!! ہاہاہاہا، مرجاو!"

☆☆☆

اس نے دوبارہ گھڑی کی طرف دیکھا۔دس۔گھڑی کی ٹک ٹک کی ساتھ ساتھ دل دھڑک رہا تھااور گھڑی کی وہ معمولی ٹک ٹک اس کے لیے کسی ہتھوڑے کی ٹھونک سے کم نہ تھی۔ادھ کھلی کھڑکی کے باہر سے بس جھینگروں کی چرچر سنائی پڑتی رہی اور سامنے میز پر پڑا لیمپ جلتا رہا۔لیمپ کی تیز روشنی میں چند چٹھیاں پڑی تھیں۔نواز نے رومال سے اپنا منہ پونچھا۔اس پورے چوبیس گھنٹے میں وہ پلنگ اور میز کی مکھی بنا رہا۔

پلنگ پر سوتا ہے، پلنگ پر کھاتا ہے، میز پر بیٹھتا ہے،شراب کے گھونٹ پی کر چند چٹھیوں کا جواب لکھتا ہےلیکن ان چٹھیوں میں ایک چٹھی ایسی تھی جو صبح سے ویسے کی ویسی پڑی تھی۔وہ کئی بار پڑھ چکا تھا اب بھی وہی کھلی تھی۔

لکھا تھا؛''آصف پلازا کے ساتھ، سپرنگ ہوٹل میں، بارہ بجے کسی کوتمہاراانتظار رہے گا''

تو وہ جانتی ہے کہ وہ بارہ سے دو بجے تک مصروف نہیں ہوتا۔سوچتے ہی وہ مسکرایا۔قلم کھول کر اس نے بارہ کو کاٹ کراس کی جگہ ساڑھے بارہ لکھ دیا۔وہ کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر دوشعر گنگنانے لگا جو اس نے کچھ دن پہلے ایک ریڈیو پروگرام میں سنے تھے؛

جیتا کس امید پہ اب تک ہوئے دامن اپنے خون سے بدتر
لاکھوں تڑپے ہم ہر موج پہ ساقی روئے کتنی بار ہم ہزار ہا ساقی

وہ ایک جھٹکے سے اٹھااور سنگھار میز کے دراز سے شراب نکالی، ڈھکن کھولا اور منہ سے لگادی۔موٹے موٹے پانچ گھونٹ حلق میں اتارے پھر بوتل ویسے ہی میز پر رکھ دی،کھلی ہوئی اور واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیااور لکھنے لگا؛

''میری برداشت کے حاشیے کم ہو رہے ہیں اجالا،اور اجالا آپ کے وہم ہمیں کافی کم سمجھتے ہیں......گلشن آہ!......آہ!گلشن، دشواری پیدا کر رہی ہو،اپنے لیے صرف اپنے لیے۔تمہاری اس دقت سے میں بس کھیل سکتا ہوں اور کچھ نہیں۔میں داغیلا نہیں لیکن سانپ سے کھیلو گی تو ڈس لے گا،دوسروں کی رگوں میں زہر گھولنا اس کا پیشہ نہیں لیکن اپنے راستے میں آنے والے ہر ایک کی رگوں میں زہر گھولنا میرا پیشہ ضرور ہے!بچ کے رہتی تو بہتر تھا مگر اب جب قریب آئی ہو تو ڈسوں کا ضرور!

دل ہے گلشن!دل!جو تم پر نہیں آیا......پر جس پر آیا ہے اس کا دل مجھ پر نہیں آیا......اجالا!......میری زندگی کا اجالا'' روشنی میں گھورتے رہنے کی وجہ سے آنکھیں جلنے لگیں اور موٹے موٹے دو آنسو پھسل کر گالوں سے نیچے

گر گئے۔

☆☆☆

ڈرائیور بڑے ہی انہماک سے موٹر چلا رہا تھا۔ دیکھنے پر لگتا جیسے نگاہ اس کی ونڈسکرین سے چپک گئی ہے۔ اس کی منشا ہے کہ کسی خالص مشین کی طرح گاڑی چلانی ہے، بنا پلک جھپکائے، بنا جمائی لیے، بنا ملے جلے اور بنا بات کیے اس لیے کہ باتیں دھیان بھٹکاتی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ لحظہ بھر کے لیے اس نے پلک جھپکائی اور گاڑی کسی ٹرک میں جا مری۔ گاڑی تو بچ جائے گی لیکن ٹرک چل بسے گا۔ کیوں؟

کیوں کہ جوانی سے اسے پختہ یقین ہے کہ جب گاڑی اور ٹرک ٹکراتے ہیں تو کار بچ جاتی ہے جبکہ نامراد ٹرک کا کچومر کے ساتھ ساتھ پیٹرول تک نکل جاتا ہے۔ وجہ وہ کمبخت بتاتا ہی نہیں۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ایک صاحب نے یوں ہی خاموشی کی پرت توڑنے کی غرض سے ڈرائیور سے پوچھ ڈالا؛ ''غفور میاں، جانتے ہو یہ کون ہیں؟ ایں؟''۔ انہوں نے شہادت والی انگلی سے اشارہ خاور میاں کی طرف کیا جو پچھلے آدھے گھنٹے سے پان کی جگالی کر رہے تھے اور کسی بات پہ موڈ آف تھا۔

ڈرائیور نے بلی کی دم کی طرح گردن تر ڑا کر کہا؛ ''میجر میجر جنرل کمال الدین کے بیٹے ہیں؟ ہیں نا ہیں''

''ھاں، ہاہا، ھاں، ھیں ٹو'' خاور یہ کہہ کر آپ ہی آپ ہنسا اور پان کی جگالی تیز کرتے ہوئے سیٹ کی سطح سے نکلنے والے دھاگے توڑنے لگا۔

''الم نشرح نہیں آپ کے حالات ہم سے، سب کچھ شیشے کی طرح شفاف ہے'' ڈرائیور ہنس پڑا اور ایک سنسنی سی خاور کے چہرے پر دوڑ گئی اور بھیجے میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ اس نے گردن گھما کر ڈرائیور کو دیکھا جس کی ناک اور آنکھ کے حلقوں کے گرد پسینہ ابھر رہا تھا۔

مصنوعی غصے سے دھاڑا؛ ''اڑے کیا شفاف ہے؟ بکو بھی!'' یہ کہتے ہوئے پان زدہ تھوک فضا میں نکلی اور ڈرائیور ڈر کر سوچنے لگا کہ صاحب کیوں خفا ہوتے ہیں۔ آخر ایک معمولی ڈرائیور کو کیا معلوم ہے کہ اتنا بڑا عہدے دار پردوں کے پیچھے کیا کیا گل بوٹے کھلاتا ہے۔

کھرا کھوٹا پن، جیسے سونے کا بس سنار جان سکتا ہے اسی طرح دلوں کا بس خدا......

''کہ سرکار آپ کتنی محنت سے کام کرتے ہیں ہم گریبوں کے لیے، کبھی چھٹی نہیں لی آپ نے، ساری پھوج جانتی ہے''۔ ڈرائیور نے اپنی ناک سے مکھی اڑا کر نہایت ہی دوراندیش لہجے میں کہا۔ خوشامد کام کر گئی۔

''ارے یہ تو بالکل عوج بن عنق ہے! جتنا وہ زمین سے دور اتنا یہ عقل سے! اچھا دوست تم یہ بتاو کہ کوئی چھم چھم چھم کا منصوبہ ہے؟'' پیچھے بیٹھے صاحب نے ہاتھ سے گھنگرو کا اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ہنسنے

لگے۔ڈرائیور کے کان کھڑے ہو گئے اور خاور کسی قدر خفگی سے باہر دیکھنے لگا۔

گاڑی کی رفتار نہایت کم ہوئی۔اس نے سائن بورڈ پڑھا۔لاہور دس کلو میٹر۔

عَو !عَو !عَو !عَو !...... بورڈ کے کافی دور درخت کے نیچے بیٹھے دو کتے بھونک رہے تھے جیسے ان کا استقبال کر رہے ہوں۔وہ پیچھے پلٹا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہنا چاہا۔شریر آنکھیں۔انگارہ اگلتی آنکھیں۔

موٹر کے ھم کے نیچے اس نے کچھ کھسر پھسر کی،ان صاحب نے زور سے اچھا کہا۔ڈرائیور نے ان کی کھسر پھسر جانے کی سر توڑ کوشش کی تھی مگر وہ صرف لفظ کڑک اور طوائف اور مشہور ہی سن پایا تھا۔

☆☆☆

''ہندو اور مسلمان صدیوں سے ایک ساتھ رہتے ہیں،ان کے رسم و رواج کہنے کو الگ سہی مگر وہ ایک دوسرے پر اپنی اپنی چھاپ چھوڑے ہوئے ہیں، گوروں کے آنے سے پہلے ہم......'' ریڈیو کا پہیا بے پروائی سے اس نے گھوما دیا۔

''گاندھی کے اس عمل پہ مسلمانوں کو......'' ریڈیو کا پہیا پھر گھوما۔

''میجر جنرل کمال الدین کا کہنا تھا کہ ہم ہندوؤں سے......''

ہر طرف بس ایسی ہی خبریں تھیں۔وہ ریڈیو پٹاخ سے بند کر کے پھسکڑا مارے بیٹھ گیا۔گاڑی لیٹ تھی۔ابھی بیس منٹ پہلے ہی وہ سٹیشن پہنچے تھے۔ریل کی ننگی پٹڑیوں سے نظریں سر پیٹ پیٹ کرا کتا چکیں تھیں۔روہت اس کے سامنے سے گزرا۔اس نے روہت کو غور سے دیکھا۔وہ کسی فلاسفر کی طرح سر جھکائے پیچھے ہاتھ باندھے ہوئے ٹہل رہا ہے اور اپنے خیالات میں لاپتہ ہے۔یقیناً کسی دقیق اور بے نتیجہ بات پہ سر کھپا رہا ہوگا۔عادت سے مجبور،اسکے دل میں...... بے شک ان لاتعداد کٹھن لمحوں سے ملنے کا انتظار ہوگا جو لا حاصل ہیں، جو انسان کو لایموت بننے پر بھی نصیب نہیں ہوتے......جیسے......جیسے موت!

انسان مر تو سکتا ہے لیکن مٹ نہیں سکتا، سجدے کرے نہ کرے لیکن وہ خدا بن نہیں سکتا......

آنند نے دیکھا کہ وجئے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے جیسے اس کی نظریں کوئی جواب مانگتی ہیں لیکن انہیں جواب مل ہی نہیں چکتا۔کئی گھنٹوں سے تینوں میں چُپ کی گانٹھ بندگئی تھی۔اور یہ چُپ تو تب لگی جب روہت لان میں ان سگار پیتے گوروں کی طرف گیا اور آنند اس لڑکی کے پیچھے اندر کی طرف اور وجئے درمیان میں چند گھڑی ٹکنے کے بعد آنند کے پیچھے لپکا تھا۔روہت کو ان گوروں نے اپنے پاس بیٹھا کر کیا بات بتائی، کیا راز فاش کیا تھا اور وجئے اسے اس طرح خون آلود نگاہوں سے کیوں دیکھتا ہے؟ آنند کے ذہن میں سوال اور سوالوں کی ہی گونج تھی مگر جواب نہیں۔نگاہیں اوپر اٹھاتے ہی سورج کی تیز روشنی سے

آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ ہولے ہولے روہت کے پاس گیا۔

''کیسے ہو روہت؟ طبیعت ٹھیک ہے؟'' اس نے ایسے ہی چھوٹی سی بیچ بات کی۔ روہت خاموش کھڑا رہا اور سوال بے سود ہو کر ہوا میں حل ہو گیا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تم چلتے پھرتے ہوئے بھی جوانی کی موت مرو، میں نہیں جانتا کہ انہوں نے تم سے کیا بات کی، اگر تکلیف دہ ہے، بس اسے دفنا دو، اور، اور اگر مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو وہ بات بتا دو جو بات جاننے کے لیے تم اتنے بے تاب تھے، روہت! مجھے راز رکھنے آتے ہیں'' آنند کے دھوپ سے دمکتے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ بکھری۔ روہت غصے سے تمتما اٹھا، ایک جوالا مکھی تھا جو پھٹ پڑا۔

''راز؟ کون سے راز رکھنے آتے ہیں تمہیں! نفرت کے ریزہ ریزہ پتھر پھیلے پڑے ہیں ان محلوں کے چاروں اور...... جن میں تم راز رکھتے ہو''

''روہت یہ تم......!''

''شش!!! بس آنند بس!'' روہت نے انگلی اٹھا کر اسکی بات کاٹی۔ وہ لہو پانی ایک کر رہا تھا اور آنند آنکھوں میں ابھرتے سمندر کو لیے اس کو مروتوں کے مزار توڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آنند بے زبان بن گیا تھا اور روہت با زبان سے کچھ زیادہ۔ وجے ٹہلتا ہوا کہیں سے آ نکلا۔

''اپنے راز چھپا کر دوسروں کے راز کیوں سنتے ہو؟''

''روہت میں نے تم سے کوئی راز نہیں چھپائے'' اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ ذرا ہٹ کر کھڑی چار پانچ عورتیں ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''پھر یہ کیوں نہیں بتاتے کہ کیا ہوا تھا اس وقت تمہیں! کیوں اس لڑکی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آیا تمہیں! میں وجہ جانتا ہوں، میں جان گیا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ تم مجھ سے چھپاؤ گے......'' روہت تھوڑا ٹھنڈا ہو گیا اور آنند کو گلے لگا لیا۔

''بتاؤ گھونچو بتاؤ، کون ہے وہ؟'' روہت ہنس پڑا۔

''میری کھوئی ہوئی زندگی ہے وہ جو پھر سے کھو گئی! میرے غم کی بے ہوشی، میرے درد کی مدہوشی اور دکھ کی بدمستی تھی وہ...... جو پھر سے کھو گئی!'' دل شکستہ مسکراہٹ لیے ایک آنسو اس کی آنکھ سے موتی بن کر گر پڑا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں میری جان، تمہیں وہ سکھ، وہ دوا، وہ چین ملے گا...... پھر سے، میں وعدہ کرتا ہوں، وعدہ کرتا ہوں میں!'' روہت نے وجے کی طرف دیکھا وہ بھی ہنس کر دونوں کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔

☆☆☆

”جانتے ہو، وہ میری دوست ہے پر میں وہاں صرف اس غرض سے جاتی ہوں کہ نظر بھر تمہیں دیکھ سکوں! لیکن تم سامنے ہی نہیں آتے تمہیں دیکھنا بہت مشکل ہے، تم تو ہر وقت میرے پاس ہوتے ہو لیکن یہ خواہش ہر وقت مچلتی ہے کہ میں بھی تمہارے پاس ہوں، تمہارے پاس جی سکوں، تمہیں دیکھ سکوں، زندگی کو دیکھ سکوں“ گلشن اس کی آنکھیں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اس کے گلابی ہونٹ ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔

کوکا کولا کی بوتل وہ کھانے کے فوراً بعد ہی پی چکا تھا اور دو سگریٹیں بھی۔ اگرچہ اس کا سگریٹ پینے کا جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن صرف اس خیال سے پی لیں کہ گلشن کو سگریٹ پسند نہیں، اس کو تو چڑھائیں، دھواں سونگھ لینے پر بس کھاوں کھاوں کیے جاتی ہے۔

”گلشن اجالا تم سے کیا باتیں کرتی ہے؟“ نواز یہ کہہ کر نے میز پر بازو ٹکا کر تکون بنا دی۔

”بس کچھ نہیں یہی عام سی باتیں ہوتی ہیں، اسے چھوڑو، یہ بتاؤ تم کہاں چھپے ہوتے ہو، پل بھر کو چہرہ ہی دیکھا دیا کرو، کوئی پگلی خوش ہو جائے گی“۔ نواز دل ہی دل میں چلایا، بڑی آئی پگلی، ڈھنگ سے لپ اسٹک لگانی تک نہیں آتی۔ ہونٹ ہیں جو لپ سٹک میں بھی برے لگتے ہیں اور ایک اس اجالا کے ہونٹ ہیں کہ لپ اسٹک کے بغیر بھی بالکل مونالیسا کے جیسے لگتے ہیں، بے اختیا انہیں چومنے کو جی چاہتا ہے۔

نواز کے منہ سے بے اختیار رال ٹپکی جو اس نے رومال سے صاف کر لی اور سوال گل کرتے ہوئے وہ کہنے لگا؛ ”تم آ جایا کرو گھر ہمارے جب دل کرے، اچھا یہ بتاؤ تم نے اپنے اور میرے بارے میں کبھی اجالا سے ذکر تو نہیں کیا؟“ اس نے نہایت ٹھمکے ٹھمکے لہجے میں کہا۔ نگاہیں گلشن کے آر پار ہو گئیں۔

بولی؛ ”نہیں کبھی نہیں کیا! ہاں تین چار دفعہ میں نے اس سے تمہارے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن وہ ٹال گئی، لیکن نواز میں کہتی ہوں اس بیچاری کو مجھے بتا دینا چاہے آخر دوست کہتی ہوں میں اسے اپنا! اسے کو بتانے میں کیا حرج ہے آخر تو پتہ چل جانا ہے دنیا کو“

ٹھن ٹھن نواز کے چہرے پر گھنٹیاں بجیں؛ ”نہیں گلشن نہیں، میری بات غور سے سنو، تمہیں کچھ نہیں معلوم، بہت معصوم ہو تم......“

گلشن شرمائی لیکن چہرے کی سرخی فوراً گم ہو کر سوال میں بدل گئی۔ نواز بن بن کر کہہ رہا تھا؛ ”بہت معصوم ہو تم، اب یہ ایسا راز ہے جو میں نے اپنے سب سے اچھے دوست تک کو نہیں بتایا، تمہیں بتا رہا ہوں کیوں کے تم سے محبت کی ہے اس لیے سب سے بڑی دوست ہو، اور محبت میں یوں باتیں چھپی رہیں، اچھا نہیں ہوتا، اس لیے کہہ دیتا ہوں، اجالا کی شادی یہی تین سال پہلے ہوئی، تب وہ سترہ برس کی تھی، یتیم ہے کوئی نہیں اس کا، ماموں کے ساتھ رہتی تھی مگر اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں، جو کچھ ہے وہ یہیں ہے، خاور میاں واپس فوج چلے

گئے......اور پھر......تم تو جانتی ہو......آہ!''

''کیا نواز؟ کیا بات ہے؟''گلشن کہے بنا نہ رہ سکی۔

''بہت سی لڑکیوں کا دل ایسا ہی ہوتا ہے گلشن، بہت کا زیادہ تر کا، جب ان کے شوہر دور چلے جاتے ہیں تو محبت کی خالی جگہیں پر کرنے کے لیے وہ آس پاس دیکھتی ہیں، اجالا نے بھی آس پاس دیکھا اور جب اجالا نے آس پاس دیکھا تو اسے صرف میں نظر آیا......میں! گلشن صرف میں! مجھ سے محبت کر بیٹھی ہے اور یہ اقرار کرنے کے بعد اس نے مجھ سے بہت سے تقاضے کیے بہت! کہنے لگی مجھے بھگا کے لے جاو میں نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا کہ میں ایسی خیر مذہبی حرکت نہیں کر سکتا، مانا کہ عمر میں تم مجھ سے چھوٹی ہو مگر ایسا رشتہ بنانے کی جرات میں نہیں کر سکتا، بھابھی کہنا چاہیے مجھے تمہیں لیکن میں تمہیں بہن کہتا ہے، چھوٹی بہن کہتا ہوں......یہ سننے کے بعد بھی اس کے جذبات سرد نہ ہوئے گلشن!......گلشن! اس دنیا میں تم جیسی خوبصورت لڑکیوں کی پارسائی اور پاک دامنی پر کوئی درندہ ہاتھ صاف کرتا ہے مگر اس لڑکی نے، اونہہ، توبہ، اونہہ یہ کب کہاں ہوا کہ کوئی لڑکی اس لڑکے کو اپنی آبرو، اپنی عصمت لوٹنے کا کہے جس نے اس کے سر پر بہن کہہ کر ہاتھ رکھا ہو!''

گلشن کا منہ کھلتا ہی چلا جا رہا تھا۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگائے بیٹھا تھا اور استغفار بڑبڑا رہا تھا۔ بنا پلک جھپکائے وہ اسے تکتے ہوئے پیچھے کرسی پر کھسک گئی۔ دماغ میں پتہ نہیں کیا کچھ سائیں سائیں کر رہا تھا۔

''او! منحوس لڑکی!''گلشن نے ٹھنڈا گرم دیکھے بغیر کہہ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

نواز نے سمجھ لیا کہ وہ بس ٹھگی جا چکی ہے، تیر عین سینے میں لگا ہے۔

☆☆☆

کچھ وقت تسی ٹھک ٹھک کرتے گزر جاتا تھا اور بچے وقت میں وہ اپنے منہ سے اپنے بھائی کے لیے دعائیں ہی نکالتی رہتی تھیں۔ بڑی ماں کے جسم سے ہمیشہ دواوں کی بدبو کے شرارے سے ابھرتے رہتے۔ سطح سمندر کے نیچے میل کی پرتیں ٹھاٹھیں مارا کرتی تھیں خصوصاً پیروں پر جہاں میل کچیل کے چاپڑ جم چکے تھے۔

ویسے تو انہوں نے بھی اپنی جوانی میں سب اتار چڑھاو دیکھے تھے پر وہ اجالا کے بارے میں کافی فکرمند رہتیں تھیں۔ جانتی تھیں کہ بیچاری کی قسمت کچھ زیادہ فراخ نہیں۔ اس کے علاوہ وہ نواز کے متعلق بہت غور کرتیں اور نواز کا اجالا کے کمرے کے دروازے کا مکھی ہونے کا بھی انہیں خوب علم تھا۔

نواز پر وقت بے وقت کی برہمی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے وہ بے قرار نظریں پڑھ لی تھیں جو اجالا پر ٹکی ہیں۔ بس ایک دفعہ یوں ہی نواز یہ کہہ دیا کہ بیٹا نظریں جھکائے رکھا کرو، عورت کا احترام لازم ہے۔ اتنی سی بات پر وہ بھڑک اٹھا۔ کہنے لگا کہ میں کوئی کنواری لڑکی ہوں جو نظریں جھکائے رکھوں اور جہاں تک احترام کی

بات ہے وہ تو میں خوب کرتا ہوں......مجھ سے زیادہ باادب اور شریف انسان اس دنیا میں نہیں!

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی انہوں نے نواز کو اجالا اور نمرہ کی باتیں سنتے دیکھ لیا۔ وہ کونے سے آنکھ لگائے دیکھتی رہیں کہ کیا کرتا ہے لڑکا۔ پانچ منٹ گزرنے پر وہ اپنے بال کھجلاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا اور بڑی ماں بالکونی میں دھوپ سینکنے چلی گئیں۔ دھوپ میں بھی بیٹھے بیٹھے ایک ہی خیال ان کا جی کھائے جا رہا تھا کہ اس صورت حال میں وہ مورچہ پکڑیں تو کون سا۔

خواہش ابھرتی کہ کاش کمال بھیا ہی یہاں ہوتے، انہوں نے نہ جانے کیوں آنا جانا بند رکھا ہے، پلٹ کر دیکھا تک نہیں کہ گھر میں بہن، بیٹا اور سوھاگ لٹی بہو کس حال میں ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ خون کی رشتہ والوں کو بس عید کے عید ہی اپنا منہ دیکھا دیا۔ اگر وہ یہاں ہوتے تو سب کو کس کر رکھتے۔

''او، ککو کی ماں!'' انہوں نے برا سامنہ بنا کر لان میں سے گزرتی ملازمہ کو پکارا۔ کالی کلوٹی ملازمہ اوپر دیکھتی اپنا جوؤں سے برا میلا سر کھجلانے لگی اور جلدی جلدی پیر چلاتی ہوئی لان پھلانگ گئی۔

سانپ کی طرح لمبی سیڑھیاں چڑھی اور بالکونی میں قدم جماتے ہی بڑبڑا اٹھی: ''جی بڑی ماں''

''یاں مر، کندھے داب میرے، درد سے مرے جارہے ہیں، اور اتنی دیر کیوں لگادی آج آنے میں، ویسے تو سویرے سویرے ہی آ دھمکتی ہو'' بڑی ماں نے تیوری چڑھا کر کہا اور ججو کی ماں بھانپ گئی کہ آج پھر کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوئی ہے جوان کے پسند کی نہیں تھی۔

''بس کیا بتاوں بڑی ماں، پڑوس کی چھوکری ہے ایک، انگریجی کے چار پانچ لفظ کہیں سے سیکھ آئی اور میرے معصوم بچے کو پٹالیا، اب میں ماری ماری پھرتی ہوں، جمانہ بہت خراب ہے میں کہے دیتی ہوں، کسی کا بھروسا نہیں'' وہ اپنے چھوٹے چھوٹے سیاہ ہاتھوں سے زور زور سے کندھے دباتے ہوئے بولی۔ ایسے ہی ایک خیال بڑی ماں کے دماغ میں آیا، کہیں نواز تو......نہیں نہیں، اپنا خون ہے اتنی گری ہوئی حرکتیں کیوں کرے گا۔ اگر باپ نہیں رہا تو کیا ہوا ماں ہے نا۔ نمرہ نے اچھی تربیت کی ہے اس کی، کسی حد تک میں گواہ بھی ہوں۔

بڑی ماں کو اس طرح گم سم پا کر وہ ملازمہ مزید کہنے لگی: ''میں نے لڑکی کے گھر والوں کو کھری کھری سنادی، جب تک جہیج میں سائیکل نہیں دو گے، سادی کو بھول جاؤ'' وہ شانے اچکا کر بولی۔

''کیا کہتے ہیں فر؟''

''کہتے ہیں کہاں سے لائیں پھوٹی کوڑی نہیں ان کے پاس''

''پھر رشتے کا کیا ہوگا؟''

''نہیں ہوگا ہرگز نہیں ہوگا، میں تو اپنے ککو کے لیے چاند سی دلہن لاوں گی جو بہت سا جہیج دے

گی ہمیں، لیکن بڑی ماں ککو ہے ایک دم پھوہڑ، چھوکری نے ایسے ایسے ٹونے کیے ہیں کہ وہ تو بنا جہیج کے لینے کو تیار بیٹھا چھپکلی کی کٹی دم کی طرح تڑپ رہا ہے! مچل رہا ہے! اب سے کیا پتہ اچھی چھوکریاں کیسی ہوتی ہیں'' وہ بولتی چلی گئی اور بڑی ماں اپنے تخیل میں کالے کلوٹے ککو کو الٹنے پلٹنے لگیں۔

☆☆☆

سٹیشن پر فصلوں کے خوشبو یا بدبو جو آپ کہہ لیں، ہر طرف پھیلی۔ میر پور میں انسانوں سے زیادہ کھیتوں کی آبادی تھی۔ جدھر دیکھو کھیت۔ گنے کے کھیتوں میں کسان منجھلے ڈالے ادھر ادھر لاٹھیاں ٹیکتے ہوئے پھر رہے تھے۔ اتنے میں ایک قلی آیا اور روہت کے چھوٹے سے بیگ پر نظر تاڑ کر اپنا میلا سر کھجلانے لگا، جس میں یقیناً سو فیصد جوئیں ہوں گی۔ چند چھوٹی موٹی چیونٹیاں تو اس کی دھوتی پر بیٹھی تھیں جو اس نے پٹی بنا کر سر پر باندھ رکھی تھی، اس لیے کہ یہ قلیوں کا نیا فیشن تھا۔

دستیاب بھی اور جھکاس بھی......سب غریب قلی مسرور ہو جاتے کیونکہ سب کی پہنچ میں تھا، البتہ اس میں صورت اور بھی بد لگنے لگتی، لیکن انہیں کیوں کوئی پرواہو۔ جیسے فیشن کی دلدادہ لڑکیاں جب دیکھتی ہیں کہ کوئی نیا فیشن چل اٹھا ہے، حالاں کہ وہ فیشن ان کے بوتھے کے ساتھ جچتا تک نہیں لیکن وہ پہنیں گی، جیسے نہ پہنا تو پتہ نہیں قیامت آ جائے گی، مر جائیں گے اور عاشق منہ پھیر لیں اور شوہر طلاقیں دے دیں گے۔

''چلو جاو، جاو نہیں چاہیے'' وجئے قلی کو اس طرح بیگ گھورتا ہوا دیکھ کر غرایا۔ قلی بیچارہ بلی کے بچے کی طرح سہما سہما منہ پھسارے دوسرے طرف چلا گیا جہاں اس کو چند سکے موٹے موٹے دوسندھیوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

شام ہونے والی تھی اور جیسے ہی گھر کے بچے کھیلتے کودتے چلے گئے تو ابا جان نے آنند کا منہ غور سے دیکھا اور کہنے لگے: ''ارے بھئی تمہارا منہ ایسا کیوں بنا ہوا ہے، بالکل چیچک زدہ طوطا!''

باہر گلیوں سے بچوں کا اپنے کسی غیر دلچسپ کھیل پر جھگڑا ہو رہا تھا، تبھی کسی بڑے نے سب کو ڈنٹ پلائی، سب بچے چپ ہو گئے، کوئی تو صاحب تھے جو شیر ہاتھی کی طرح دھاڑ دھاڑ کر کہہ رہے تھے کہ مہمان کیا کہیں گے کیسے جاہل لوگ ہیں۔ بچے اس ڈر سے کہ کہیں مہمان نہ چلے جائیں، دور فصلوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح اچھلتے کودتے چلے گئے۔

''سفر کی تھکان'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ابا کا ماتھا ٹھنکا۔ گوند سے اپنی نظریں اس پر چسپاں کر دیں۔

''ایک چوتھائی دن گزر گیا اب تک تھکان نہیں گئی؟'' اس نے ناں میں سر ہلایا۔

ماں جو تو تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے لال کا منہ ماتھا چوم چاٹ کر چلی گئی تھی باہر کھڑی پڑوسنوں سے آنند کی

تعریفیں کر رہی تھی۔ کتنی خوش لگ رہی تھی ماں اور ہوں بھی کیوں نا؟۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اب بوڑھی بھی ہونے لگی ہے اور زیادہ تر بیمار رہتی ہے کتنے عرصے سے خواہش ہے کہ ماں کی سیوا کرنے کے مواقع ملیں۔

ابا جان کی تجربہ کار آنکھیں تاڑ گئیں کہ لڑکا اپنے تار کہیں جوڑ آیا ہے کمبخت!

لیکن خاموش رہے۔ دبلی سی مسکراہٹ چھن سے غائب ہوگئی اور اسکی جگہ ایک جاندار ناراضی اور ڈر اور نہ جانے کون کون سے منفی جذبات نے لے لی۔

بولے: ''پتر! تجھے معلوم ہو گیا ہے تو بتا دے تیری مرضی کیا ہے؟''

''کس بارے میں باو جی؟''

''ارے تیری اور بجو کے بیاہ کے بارے میں!''

''کیا!! کبھی نہیں! ہاہاہا! اس پاگل سے میں کیوں شادی کرنے لگا آخر دنیا میں کیا لڑکیاں مر گئی ہیں جو میں اس لڑاکا جنگجو سے شادی رچانے کا خواب بُن بیٹھا، ہاہاہا! نہیں، نہیں کبھی نہیں!'' وہ اٹھ کھڑا ہوا اور گھڑے سے پانی بھرنے لگا۔ ابا بھی کھڑے ہو گئے۔

''وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا تو اس رشتے سے خوش نہیں، لیکن یہ رشتہ کرنے کا تیری ماں نے فیصلہ کیا ہے''

''وہ کون ہوتی ہیں فیصلہ کرنے والیں!!'' اس نے پانی سے بھرا گلاس زور سے زمین پر پٹخا۔

پھر وہ یک دم سہم گیا جیسے اپنی غلطی پہ ندامت کرنے ہی لگ گیا ہو۔ آہستہ آہستہ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''نا! وہ بہت کچھ ہوتی ہیں میری زندگی کے فیصلے کرنے والیں، لیکن باو جی میں اس رشتے سے خوش نہیں، میں نہیں جی پاؤں گا اس کے ساتھ جس کے ساتھ میری دھڑکنیں نہیں چلتیں، بس! ماں سے کہہ دیں! میں ان کے قدموں کی خاک! مگر یہ رشتہ قبول نہیں!''

''آنند عزت کا سوال ہے!''

''کوئی پروا نہیں'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''آنند اسی میں تمہاری زندگی کا بھلا ہے!''

''ایسے بھلے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں جو مجھے خود سے دور کر دے...... مجھے میرے پیار سے دور کر دے''

''آنند قسم! تمہاری ماں نے قسم کھائی ہے!''

''ماں کی قسم چھوٹی نہیں لیکن میں نے محبت کی قسم کھائی ہے! اور ماں کی ممتا!...... اور ماں کی ممتا

اسی محبت کا ایک ٹکڑا ہے، اسی پیار کا ایک حصہ ہے...... جو میرے دل میں ہے، میری جان میں ہے!''
ابا بے زبان ہو گئے۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ الفاظ ان کے منہ سے نکل ہی نہیں رہے تھے۔

''ماں کی بد دعا لو گے...... مرنے کے لیے کوئی چوکھٹ بھی نصیب نہیں ہوگی!''

''اس رشتے کے بعد میری ماں کو میرا سرور، میری خوشی، میرا انشاط، میری شادمانی بھی نصیب نہیں ہوگی''

''چونکہ میں بہتر جانتی ہوں! اس لیے ہاں! نصیب ہوگی! ہوگی آنند! تمہارے آنگن میں خوشیاں ہوں گی، سرور ہوگا، شادمانی ہوگی!'' پیچھے سے ماں خون جگر پیتی ہوئیں اندر داخل ہوئیں۔ ان جھریوں سے بھرے چہرے پر آنسوں کے انبار تھے اور ماتھے کا سندور سلوٹوں کی نظر تھا۔
آنند کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس نے آگے بڑھ کر ماں کے بوڑھے ہاتھ تھام لیے اور انہیں چوما ہی تھا کہ انہوں نے پیچھے کھینچ لیے اور خوں ریز سرد نگاہوں سے اس کا چہرہ تکنے لگیں۔

''چو کتے ہوئے اگر اس طرح نادانی میں کلائیوں سے چوڑیاں اتارو گے تو ٹوٹ جائیں گی ...... خون بہے گا...... جذبات کے جلتے چولھوں میں ہاتھ دو گے تو جل جاو گے، ایک بار جل کے بھی بار بار جلو گے'' ماں روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور قطرے ندی کی طرح رخسار پر بہہ رہے تھے۔

''ماں! ماں تمہارے روٹھنے کے خیال ہی سے بچپن میں دل دہل جاتا تھا...... اب تک یہ اسی طرح دہل جاتا ہے............ دُہرا ہو جاتا ہے........... دہک جاتا ہے! محبت کی دھار لے جاتی ہے اسے کہیں دور...... جہاں صرف سکون ہوتا ہے، جہاں کوئی نہیں ہوتا........... جہاں صرف تم ہوتی ہو، میں ہوتا ہوں اور خدا ہوتا ہے!...... پر ماں؟............ کیا تمہاری وہ قسم تمہارے لیے میری خوشی سے بڑی ہے؟...... کیا نادان قسمیں ٹوٹنے کے لیے نہیں پیدا ہوتیں؟''
انہوں نے آنند کے گال پر اپنے ہاتھوں سے آنسو پونچھے۔ تھوڑا ہنس کر پھر روتے ہوئے بولیں؛

''تمہارے لیے میں ایک لمحے میں جان دے سکتی ہوں لیکن اپنی زبان پر پورا اترنے کے لیے ہزار کیا لاکھ سال سسک سسک کر مرنے مارنے کو تیار ہوں! ہاں! یہ بیاہ ہوگا، اس گھر میں چوڑیاں چھمکیں گی اور ڈھول بجیں گے اور تمہارے چہرے پر دھان پان سی بھی نفرت اور جھلاہٹ نہیں ہوگی! ورنہ...... ہاں! ورنہ! اس، اس دہلیز پر میری زندگی پڑی ہے!'' انہوں نے میز پر پڑی چھری کی طرف اشارہ کیا۔ آنند نفی میں سر ہلاتا رہا، روتا رہا۔

ابا بیچ میں آئے، ہاتھ جوڑنے لگے: ''او بھگوان کا واستہ ہے او آنند، یہ ہاتھ جنہوں نے تجھے پالا ہے پوسا ہے، آج صرف تیرے ہی لیے نہیں، دو اور زندگیوں کے لیے بھی تیرے آگے جڑے ہیں، ہمارا

خیال کر'' ابا رو رہے تھے۔بہت رو رہے تھے۔

اس نے انہیں کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔اب وہ کیسے مچل گئے تھے، کیسے جذبات کی ظغیانی اچھل پڑی تھی، کیسے موت کا فام چہرے پر چڑھ گیا تھا۔رن کے کھیتوں میں سخت رنجش میں آ کر ماں چھری کی طرف لپکی۔ابا نے زور سے پکڑ لیا۔چیخنے چلانے لگے۔

''جانے دو مجھے! یہ نہیں مانے گا! اس سے بہتر ہے میں مرجاوں! بیٹے بیٹے!''

''ارے کیا کر رہی ہو! ہوش میں آو! آنند!'' انہوں نے بڑی مشکل سے ماں کو قابو میں کیا۔

باہر سے جو چاچا، چاچی سب گھر والوں نے چیخ وپکار سنی تو دوڑتے ہوئے آ گئے اور وہ بیچ بیٹھتے ہی سر پکڑ کر رونے لگیں اور آنند اپنے گال رگڑتا باہر چلا گیا۔

وہ جب تیزی سے رنجش وملال کے لیے سامان سمیٹنے لگا تو وجے اور روہت بھونچکے رہ گئے۔ان کی حمت نہیں بندھی کہ اس سے زیادہ کچھ پوچھیں۔

''کیا کر رہے ہو؟ کیا ہوا ہے؟ آنند!؟''

''ہم یہاں نہیں رہیں گے، واپس جا رہے ہیں ہم!''

''لیکن ہوا کیا ہے؟''

''بس!!! چلو یہاں سے!!!'' اس نے چلا کر کہا اور بیگ کندھے پر ڈالتا زور زور سے چلتا باہر نکل گیا۔وہ دونوں تیزی سے اپنا سامان سمیٹ کر اس کے پیچھے بھاگے۔

وہ سٹیشن پہنچے اور معلوم ہوا کہ لاہور جانے والی گاڑی آدھے گھنٹے میں پہنچنی تھی۔

نمی سے بھری زمین میں دبے بیجوں کو نکلنے سے کون روک سکتا ہے......آخر سورج مکھی کو سورج کی طرف دیکھنے سے کون روک سکتا ہے......آخر عاشق کو لاحاصل کو حاصل بنانے کی تلاش میں نکلنے سے کون روک سکتا ہے......بس صرف ایک............بس صرف ایک خاموش خدا!......اور کوئی نہیں۔

عشق نے کتنوں کو بگاڑا، کتنوں کو سنوارا۔جواب جو بھی ہو لیکن سچ ہے کہ پیاسا پانی کے بغیر نہیں رہ سکتا اور عاشق معشوق کے، انسان خدا کے، زندگی موت کے، دن رات کے اور آنند......اور آنند اجالا کے......

☆☆☆

تیسرا باب

آنسو اور شمع......

گھڑی منہ پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، جیسے چڑھا رہی ہو۔اس کی ٹک ٹک کہہ رہی ہو وہ تمہاری سہیلی جو نام کی سہیلی تھی اب وہ بھی نہیں رہی۔اب وہ ڈائن ہے جو اس خزانے کے ساتھ رہتی ہے جس کی اسے تمنا ہے، جسے وہ جی جان سے چاہتی ہے، جس کے بارے میں سوچے بغیر نہ اس کی صبح ہوتی ہے اور نہ شام۔اس کا دل کبھی کبھی تو وہ نام تسبی کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔وہ اسے جھڑکتی ہے لیکن چند گھڑیوں بعد وہ اپنے ہونٹ، نواز نواز کرتے ہوئے پاتی ہے۔ہفتے بھر میں کئی بار تو نیند میں اس کا نام بڑبڑاتی ہے۔ اگر گلشن کے ماں باپ نہ چل بسے ہوتے اور وہ اکیلی اپنے بھائی اور چچا کے ساتھ نہ رہتی ہوتی تو ضرور سب جان جاتے کہ وہ راتوں کو کیا کچھ بڑبڑاتی ہے اور چھت پہ بیٹھ کر چاند تکتے ہوئے کس کے خواب بنتی ہے۔

ٹک ٹک......ٹک ٹک......گھڑی کی سوئی کے ساتھ ساتھ دل دھڑک رہا تھا۔کالج میں کوئی امتحان تھا، خود کو تیار کرنے کے لیے کوئی کتاب اٹھائے بیٹھی تھی وہ۔اس نے ہر ایک طریقہ استعمال کر لیا جو اس کی استانی نے، پڑھائی میں جی لگانے کے نسخوں، میں بتایا تھا۔خیال آتے ساتھ ہی بھٹک جاتے۔وہ پلنگ سے اٹھی اور کمرے میں مضطربانہ ٹہلنے لگی۔

سٹڈی ٹیبل جس پر چند کتابوں کا ڈھیر لگا تھا، اس کے ساتھ ہی دو تین گلاب پڑے تھے۔

اجالا، اجالا بڑی کمبخت ہو......وہ زیرلب بڑبڑائی۔کیسی جاہل ہو، اور میں تمہیں کیا سمجھ بیٹھی تھی، مانا کہ میں زیادہ ہمدردی نہیں رکھتی تھی تم سے پہلے لیکن نفرت بھی تو نہیں تھی، میرے لیے تم ایک عام سی لڑکی تھی جسے کسی

دوست کی ضرورت ہوتی ہے جسے ہمدردی چاہیے ہوتی ہے، مگر جو آج میں نے حقیقت جانی ہے......افو!!تم کیسی بھدی ڈائن ہوا جالا......اجالا ایک بیسوا ہو تم!''

''گلشن ذرا چائے تو بنا دو'' ایک لمبا تڑنگا سا لڑکا اندر داخل ہوا اور اسے اس طرح بیکار کھڑا دیکھ کر کہنے لگا۔اس کا بھائی جس کی عمر زیادہ سے زیادہ پندرہ برس ہوگی، اپنے لوفر دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کھیل کر اب گھر لوٹ رہا تھا۔

گلشن پہلے ہی کڑوی ہو رہی تھی، تیوری چڑھا کر بولی:''نگوڑے،خود بنا لو، ہاتھ پاوں نہیں معزور ہو کیا؟''

لڑکا سہما سہما پاس بیٹھ گیا اور گلشن پتیاں گلاب سے جدا کرتی غصے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ نمرہ آپا کو سب کچھ بتا دے گی سچ سچ۔اب بس حمت باندھنی تھی ۔فلاکت زدہ انسان کے لیے سب سے مشکل کام ہمت باندھنا ہوتا ہے اور ہمت والے انسان کے لیے سب سے آسان کام فلاکت و بدنصیبی سے نکلنا۔اس نے وہ جذبات بیان کرنے تھے جنہیں وہ زمانے کی امیدوں کی گٹھڑی کے نیچے دبانا چاہتی ہے لیکن وہ نہیں دبتے اور اس گٹھڑی کو اٹھا کر الٹا دیتے ہیں۔ایسے زمانے کی امیدوں کی گٹھڑی الٹانے والے جذبات وانسان کوئی امکا ڈھمکا نہیں ہوتا......وہ تو وہ ہوتا ہے جس سے پریم ہوتا ہے......جس سے پیار ہوتا ہے، جس میں اپنی جان ہوتی ہے......اپنی دھڑکن ہوتی ہے......

ایک حد ہوتی ہے یہ بوجھ میں نہیں سہہ سکتی۔اس نے اپنے آپ سے کہا۔کیوں وہ اپنی مرضی کی زندگی نہیں جی سکتی۔کیوں لڑکیوں کو شیشہ اور کاغذ سے بنا سمجھا جاتا ہے کہ ذرا سی آنچ آئی اور وہ ٹوٹ جائیں گی۔جذبات کے تیز بہاو میں اس کو اپنا آپ گم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

جب سے اس کے دل میں کسی کا تصور آتے ہی آہیں نکلنی شروع ہوئی تھیں تب سے گلشن اسے سپاٹ گھسیٹتی ہوئی کہیں لے جاتی......سنیما، پارکس، ساحل سمندر اور سنیما، پارکس اور ساحل سمندر۔

پر وہاں بھی کچھ فرق نہ آتا......فلم کے ہیرو کا چہرہ ہٹ جاتا اور دل کے ہیرو کا چہرہ آجاتا ہے اور اسے دیکھتے ہی جذبات فوارے کی طرح پھوٹ پڑتے، پارک کے پھول دیکھ کر اس کے ہونٹ یاد آجاتے اور ساحل سمندر کی لہروں کے پر سکون شور کو سن کر کسی کی آوازیں سنائی دیتیں تخیل میں وہ کسی سے باتیں کرتی۔

وہ نوجوان وہ سب کچھ تھا جو اس کا شوہر نہیں تھا اگرچہ انہوں نے کبھی بات تک نہیں کی تھی، ایک دوسرے کا نام تک معلوم نہیں تھا مگر اس کی آنکھیں......وہ تیز آنکھیں......وہ جاں بہ لب آنکھیں......وہ تو کتنے لاکھ لفظ چند لمحوں میں کہہ گئیں......آنکھیں جھوٹ نہیں بولتیں......

زندگی میں پہلی بار اس کی نبض اتنی زور سے اچھلی تھی۔بیس سال تک دوسرے اس کی زندگی کا

فیصلہ کرتے آئے تھے...... یوں لگتا ہے جیسے لڑکیوں کی زندگی پہلے سے ہی مرتب ہوتی ہے۔

وہ جانتی تھی کہ ماموں نے شادی کے لیے ہامی کمال الدین کے دباو میں بھری چوں کہ وہ غریب تھے اس لیے سر نہ اٹھا سکے۔ شادی کے چند مہینوں بعد ہی کسی بیماری سے چل بسے...... شاید ٹی بی یا کینسر۔

وہ جیسے ہی گھر میں آئی، خاور کا رویا بہت حد تک بدل گیا۔ وہ شریف شرماتی مسکراہٹ بدل کر شیطانی ہوگئی۔ اس نے دوسرے روز ہی حکم دے دیا کہ وہ جارجٹ کی ساڑھیاں پہنا کرے، چٹاخ پٹاخ سی چوڑیاں اور آنکھوں میں کاجل ڈالا کرے اور نظروں میں بے حیائی انڈیلا کرے۔ خاور نے اس کے بات کرنے کے ڈھنگ تک کو قابل قبول نہ سمجھا...... یہ بات کیوں کڑوے انداز میں کرتی ہو، میٹھے انداز سے کرو، مجھے دیکھ کہ مسکراتی کیوں نہیں، ڈرتی کیوں ہے، جب جب مجھے دیکھو تو مسکرا نہ، اور جب میں تمہیں بلاوں تو بنا کسی جھجک کے آکر مجھ سے چمٹ جانا......اور پتہ نہیں ایسا کیا کیا تھا۔

ایک دن تو وہ چھری لے کر آ گیا، پتہ نہیں کس بات پر مرچیں لگی ہوئی تھیں۔ بدن شعلوں کی طرح قلانچیں بھر رہا تھا۔ وہ چپ رہی اس ڈر سے کہیں بات کی تو زبان ہی نہ کاٹ ڈالے۔

ماضی کی یاد سے اس کی آنکھوں میں گرمائش پیدا ہوئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی زبان جل رہی ہے۔ اس نے فوراً گرم تھوک نگلی اور باہر چلی آئی۔ نواز کا کمرہ اوپر تھا، نمرہ آپا کے پڑوس والا۔ دونوں کمرے بند پڑے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی وہ سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اترنے لگی۔

بڑی ماں!......اس کے ذہن میں یک دم خیال آیا...... کیوں نہ ان سے بات کروں، وہ سمجھیں گی میری بات، بھلا پرانے زمانے کی سوچ ہے لیکن وہ لڑکیوں کے جذبات جانتی ہیں، دنیا دیکھی ہے انہوں نے۔ مگر مریل سی ہمت ٹوٹ گئی اس خوف سے کہ کہیں پرانی روایات نے آنکھ کھول لی تو آفت نہ ٹوٹ پڑے۔ گھر ہی ٹوٹ جائے گا، نہ وہ ادھر کی رہے گی نہ ادھر کی۔ بڑے تنگڑے بھئے نے جی پست کر دیا۔

''اجالا!'' آواز آئی۔ گلشن بڑے بڑے قدم بھرتی ہوئی دروازے کے پاس نظر آئی۔ وہ یک دم کھل اٹھی۔ گلشن مسکرا رہی تھی، بالکل ہی چبھنے والی مسکراہٹ جسے کوئی گلی کا لڑکا گالی دینے کے ساتھ ملائے گا، لیکن اجالا خوش تھی۔

عام طور پر گلشن شاموں سے پہلے ہی آیا کرتی تھی لیکن آج صبح صبح آ ٹپکی۔ دونوں کی ملاقات نصف سال پہلے ہی ایک پارٹی میں ہوئی تھی۔ جب گلشن نے نواز کو دیکھا تھا تب اسے اجالا سے دوستی کرنی پڑی۔ دل سے نہیں پر دل پہ پتھر رکھ کے۔ کڑوی دوا جس کا اثر میٹھا ہوتا ہے اور دیرپا ہوتا ہے۔

اجالا اس کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ گلشن نے چاروں طرف دیکھ کر کمرے کا جائزہ لیا پھر پوچھا: ''نمرہ آپا کا کمرہ اوپر ہوتا ہے''

''ہاں ان کا اوپر ہی ہوتا ہے، یہاں آ وادھر بیٹھو......'' اس نے جواب دیا۔ گلشن پاس بیٹھ گئی۔ نوکرانی گلشن کے لیے چائے لے آئی، اجالا نے لے کر گلشن کے ساتھ میز پر رکھ دی۔

''اور بڑی ماں کا؟''

''ان کا وہ ساتھ والا کمرہ ہے، کبھی کبھی اگر مجھے رات کو اکیلا محسوس ہو یا ڈر لگے، میں انہی کے پاس چلی جاتی ہوں'' اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ تیز کرنیں اس کے چہرے پر پڑیں۔

''ہی ہی، ڈر کس بات کا؟......نواز...... بھائی جو ہوتے ہیں، ان کا کمرہ کون سا ہے'' گلشن نے چائے کی زور سے پُر چسکی لگائی۔ نام سنتے ہی اجالا کی الجھنوں کا بٹاوارا ہوا، مراد اور واضح ہو گئیں۔

''ہاں اوپر والا ہے'' اس نے جلدی جلدی جواب دے دیا اور گلشن کے پاس بیٹھ گئی۔

گلشن نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور سوچا؛ کیسا پھیکا پھیکا سا ہو رہا ہے، لگتا ہے رات بھر جاگی ہے، کیا اسے یہ تو پتہ نہیں چل گیا کہ نواز مجھ سے پیار کرتا ہے......نہیں......نہیں یہ کوئی اور ہی سوگ منا رہی ہے، اس کی آنکھیں بولتی ہیں۔ لگتی ہیں کہ پھٹ پڑیں گی، بہہ جائیں گی......ساحل کی لہروں کی طرح۔

''کیا ہوا؟'' گلشن نے میٹھے لہجے میں کہا۔ اجالا خاموش رہی۔

اسے شک پڑا کہ اجالا جذبات سے ابل پڑنے کی آخری سیڑھی پر کھڑی ہے، اس نے اپنی بات کو زیادہ تاو دینے کا سوچا۔ کہنے لگی؛ ''دیکھو اگر تم مجھے اپنی بہن سمجھتی ہو تو...... بتا دو مجھے جو دل میں ہے، دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا......اور، اور اگر مجھے اپنی بہن نہیں سمجھتی تو رہنے دو!'' اس نے بڑے رقت بھرے انداز سے آخری جملہ کہا۔

اجالا اپنا سر جھکائے بیٹھی تھی، اس کی باتیں سنیں تو کہہ دیا؛ ''نہیں نہیں تم میری بہن ہو، بلکہ بہن سے بڑھ کر ہو اور......'' اجالا بیچ میں رک گئی اور گلشن نے چائے کی چسکی لے کر دل ہی دل میں کہا کہ اب آئی نہ ڈائن لائن پہ۔

کافی دیر خاموشی رہی اور لان میں چہچہاتی چڑیوں کے گانے کی آواز آتی رہی۔ گلشن نے اس کا ہاتھ تھام لیا جو برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اجالا نے نظریں اٹھیں، آنکھوں میں گہرے گہرے آنسو تھے برسنے کو تیار اور روشنی کی دھندلی کرنیں ان میں پڑ رہی تھیں جس سے آسمانی رنگ کی پتلیوں کا خوبصورت رنگ اور بھی واضع ہو گیا تھا۔

''گلشن، مجھے معلوم ہے تم یہ باتیں کسی کو نہیں بتاؤ گی......اصل میں بات ہی کچھ ایسی ہی ہے جو رشتوں کو جلا دے گی اور میں نہیں چاہتی کہ رشتے جلیں لیکن گلشن اگر رشتے نہ جلے تو میرا دل جلے گا، جلتا رہے گا ساری عمر...... مجھے پیار ہے کسی سے گلشن......میں عشق کرتی ہوں کسی سے!...... یہ دل جھلس رہا ہے جل رہا ہے

کسی کی یاد میں......کانوں میں کوئی چیختا ہے جاو! اس کے پاس جاو!......آنکھیں بند کروں تو اس کی تصویر سامنے آجاتی ہے، کھلی ہوں تو ہر طرف نظر آتا ہے!......اب بھی وہ یہاں ہے میرے پاس ہے، یہاں میرے پاس بیٹھا ہے وہ!......اس کی آنکھوں کی چمک دیکھو کتنی سندر ہے کتنی مکمل ہے، میں نہیں رہ سکتی اس کے بغیر گلشن، مرجاوگی اس کے بغیر! میں مر......'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''سماج مار ڈالے گا تمہیں......کیا کرو گی......معاشرہ نگل جائے گا تمہیں''

''سماج نے مارنا اور معاشرے نے نگلنا ہی تو ہے......پیار جو کر بیٹھی ہوں......لوگوں سے کہاں دیکھا جانا ہے!'' یہ باتیں کرتے ہوئے اس کے دم کا ٹھہراو ختم ہونے لگا۔ آنکھوں سے موٹے موٹے قطرے جھولی میں گرے۔

''جانتی ہو کون ہے وہ؟'' گلشن نے محسوس کیا کہ ہاتھوں کی ٹھنڈک ختم ہو رہی ہے۔ وہ تپنے لگے ہیں جیسے پگھل رہے ہوں اور اس کی آنکھیں ایسی ہیں جیسے ہو بہو درد اور بے بسی کی تصویر ہوں۔

آنسو پونچھ کر وہ بولی؛'' دل پہ دستک ہوئی ہے......بجانے والا دیکھا ہے......جانتی نہیں کہ کون ہے......مگر جاننا چاہتی ہوں کہ کون ہے''

''اجالا اجالا، میری جان......دل پھیر جاو، کیا ایسا ممکن نہیں، انسان اگر چاہے تو کچھ بھی کر سکتا ہے......اس عشق کو اگر دم نہ دو تو مر جاتا ہے......''

''نا! نا! اس کمبخت کو دم نہ دو گے تو اور دم پکڑے گا......یہ ایسی آگ ہے جو رشتوں کو لکڑی سمجھ کر کھائے گا......اور بھڑکے گا اور آگ لگائے گا! اور، اور دم پکڑے گا!''

''تمہاری طرف تو آگ ہے اگر دوسری طرف بھی لگی تو رشتے ناطے، سب کچھ جل کہ راکھ ہو جائے گا، دین دنیا سب بھسم ہو جائیں گے......اپنے ان رشتوں کو سانس کا قرار تو پکڑ لینے دو، سب ٹھیک ہو جائے گا'' گلشن کچھ دیر خاموشی میں اس کے گالوں پہ ڈھلکتی گیلی لکیریں دیکھتی رہی۔

اجالا یک دم سسکیاں بھرتے ہوئے گلشن کے ساتھ چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ روتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ کہیں کوئی آ نہ جائے، سن نہ لے، ڈر کے مارے گلشن اسے چپ کراتی رہی اور اس کی بھی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

☆☆☆

نمرہ نے جو قمیض نکالی اس کے سب بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ جی جل کر راکھ ہو چکا تھا اور مغض میں چیونٹیاں رینگنے لگیں اور جی چاہا کہ فوراً جا کر دھوبن کو دو لاتیں رسید کرے۔ آہ کوئی فائدہ نہیں، اتنی دور جانا محض حماقت ہے، وہ آپ ہی آپ کہنے لگی۔ صندوق سے پلٹی تو نظر میز پر رکھی تصویر پر ٹھہر گئی۔

کوئی شوخ وشنگ جوان تھا جس کی آنکھیں نواز جیسی تھیں اور ہونٹ بالکل بڑی ماں کے جیسے تھے۔

بے اختیار اس کا رونے کو جی چاہا۔ وہ سوچنے لگی، اسی ہفتے دونوں کو بچھڑے پورے چھ سال ہو جائیں گے اور نواز بھی بیس کا ہو جائے گا، کتنا اچھا ہوتا کاش آپ بھی یہاں ہوتے، دیکھتے آپ کے جانے کے بعد کتنا کچھ بدل گیا ہے، خوشیاں جو پہلے ہمارے آنگن میں کھیلتی تھیں، انجانی چڑیوں کی طرح دانا چگ کر اڑ گئیں اور پلٹ کر نہیں دیکھا، تو کیا ہوا جو ہمارے پاس مال ہے، دولت ہے، عزت ہے لیکن جو نہیں ہے وہ محبت ہے، وہ خوشی ہے، وہ سکون ہے، اس چار دیواری میں آ کر دیکھتے آپ کہ کس طرح ہم اجنبیوں کی طرح گھٹ گھٹ کہ مر رہے ہیں، کس طرح موت کے منہ میں جانے کا خیال مجھے سہانہ لگ رہا ہے...... موت اگر ایسی زندگی سے نجات کا راستہ ہے تو میں دعا کرتی ہوں کہ جلد مر جاوں۔ فریم کو وہ منہ کے پاس لائی اور بوسہ دیا اور سینے سے لگائے سسک سسک کر رونے لگی۔ چند بوندیں گالوں سے پھسل کر فریم پر گر گئیں۔

''خدا تمہیں مجھ جیسے لوگوں پر خودکشی حرام نہیں کرنی چاہیے تھی، کیا ہو جاتا جو ہمیں ذرا سکون مل جاتا، ہمارا بھی وہی انجام ہو جاتا جو ہمارے پیاروں کا ہوا، کیا شان میں بٹہ لگ جاتا جو ہمارے بارے میں بھی کچھ سوچ لیتے، یہ کسی وحشت ہے جو مجھے زندگی سے ہونے لگی ہے، یہ کیسی عزت ہے جو میرے گلے کا پھندا بن گئی ہے، یہ کیسی دنیا جو جہنم کا نمونا لگتی ہے، زندگی گزار کر ہم تو عادی ہو چلیں گے ان دکھوں کے ان تکلیفوں ......روز گھٹ گھٹ کے مرنے کے...... جہنم میں پھینک کر آپ کو میری نفرت ہی ملے گی پچتاوے نہیں...... کاش کہ میں غلط ہوں! کاش آپ میرے بارے میں بھی سوچتے ہوں! کاش کوئی راحت تیار ہو میری بھی زندگی کے لیے'' موٹے موٹے آنسو بے تحاشا گالوں پر برسنے لگے جن پر جھریاں نمودار ہونے لگیں تھیں۔

☆☆☆

''او تم پھر آ گئے، لالچی مکار، اس دفعہ تو میں تم سے کرایہ لوں گا، کرایہ، پوری...... پورے تین روپے روز کے اور روٹا کپڑی کے الگ سے پیسے ہوں گے اور میرا کمیشن الگ، اور اگر نہیں دے سکتے تو تمہیں اجازت ہے کہ تم جمشید کے پاس سو لو، تم اُدھر سو گے تو میں تمہیں تین روپے دوں گا، جاو جاو، چپ کیوں ہو گئے...... بولتی بند ہو گئی سپیروں کی...... پھوٹی کوڑی نہیں ہو گی غریبوں کے پاس، آ جاتے ہیں یہاں، چاچا، چاچا کرتے، یہاں چاچا نے کوئی نوٹوں کی فیکٹری کھود رکھی ہے، ایں!'' مٹر چاچا کی بات ختم ہونے میں کافی وقت لگ گیا۔ انہیں اس طرح خاموش دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔ نفرت اور غصہ آنند کی آنکھیں دیکھنے کے بعد باہر ہوتی بوندا باندی میں گھل گیا۔

''اندر آ جاو، جھوٹے لالچی مکار!'' وہ اپنی تشریف کھجلاتے اندر لوٹ گئے۔

جس کمرے میں وہ کچھ دن پہلے رہے تھے اس میں انگیٹھی جل رہی تھی اور لکڑیوں کی، کڑکڑ تڑتڑ، کی دلکش آواز آرہی تھی۔ پاس ہی برتن میں دودھ پڑا تھا۔ گرم دودھ کیونکہ دھواں نکل رہا تھا پر وہ دھواں ہوا کو چھوتے ہی فنا ہوجاتا، نا کہ انگیٹھی کے دھویں کی طرح جو اوپر اوپر چھت کی طرف اٹھتا اور کمرے میں کھڑے ہونے والوں کی آنکھوں میں مرچیں چھڑکتا اور گلے کو پھانسی لگاتا۔

وہ تینوں کھانستے ہوئے نیچے بیٹھ کر دودھ تاڑنے لگے۔ چاچا نے تین پیالیاں نکالی الماری سے اور ان میں دودھ انڈیلا۔

وجئے کو پیالیاں غور سے دیکھا تو وہ پھنکارے: ''او، دھو کے رکھی تھیں مفت خورے......'' وجئے سہم گیا۔ دودھ کی پیالیاں اس نے ان کی طرف بڑھا دیں اور خود اٹھ کر کچھ منمناتا، دھویں میں کھانستا ہوا باہر نکل گیا۔ آنند نے اپنا سیاہ کوٹ اتار کر پاس کرسی پر رکھ دیا، باہر سے ہلکی ہلکی بوندا باندی کی آواز آرہی تھی۔

☆☆☆

گاڑی میں بیٹھے ہوئے وہ اپنی ایک بند آنکھ دبا رہی تھی جبکہ دوسری میں پانی کی واضع تہہ سامنے تھی، کمر جھکی ہوئی تھی اور پھیپھڑے ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری طرح اپنے اندر ہوا نہیں بھر رہے۔ ہوا اندر کچھ محسوس کروائے بنا واپس لوٹ جاتی۔ گلشن نے بہت کوشش کر چکی تھی کہ نواز کی بات کو سچ ماننے کی لیکن اس کے خیال ان آنکھوں پر آ کر اٹک جاتے۔ بھیگی بھیگی آنکھیں اس گیلی سڑک کی طرح جس پر وہ گاڑی جارہی تھی۔

اور اجالا جو اسے بتا رہی تھی اگر وہ سچ ہوا، وہ کیوں جھوٹ بولے گی اور نواز، نواز کیوں جھوٹ بولے گا، اسے کیا ضرورت پڑی ہے وہ تو مجھ سے محبت کرتا ہے، وعدے کیے ہیں اس نے مجھ سے......

وہ ذہن کو بھٹکانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جس پر دھندلے دھبے پڑنے لگے تھے اور بارش کی بے تحاشا بوندیں اپنا منہ کھڑکی سے رگڑتی ہوئی نیچے جارہی تھیں۔ ڈرائیور ایک ہاتھ سٹیرنگ پہ رکھے دوسرے ہاتھ سے منہ میں بیڑا دھکیل رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی آنکھیں بند کیں اجالا کی سسکیاں کانوں میں پڑیں وہ انہیں بھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ کاش اس نے وہ سب کچھ سنا ہی نہ ہوتا، اب ان دونوں میں سے کوئی ایک تو جھوٹا تھا، نواز......نہیں وہ محبت کرتا ہے اور اجالا......وہ آنکھیں!

اچانک گاڑی جھٹکے کھاتے ہوئے رک گئی۔

☆☆☆

''اجالا کیسا لگ رہا ہے مجھے گھر میں پا کر......'' وہ بولا۔ غروب ہوتے سورج کی کرنیں سامنے والے کھلے دروازے پر پڑ رہی تھیں۔

''اچھا!'' اس نے خاور کا منہ دیکھ کر جھوٹ بولا۔

’’بہت انتظار کیا ہوگا نا میرا، خی غی......غی خی، اب میں آ گیا ہوں، پورا ہفتہ رہوں گا‘‘

’’ہفتہ؟‘‘

’’ہاں پورا ہفتہ......‘‘ خاور نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اجالا نے کوئی مزاحمت نہیں کی، اور نہ ہی شرمائی۔ پہلے کی طرح نہیں جب وہ ہر بار دوبارہ سے مزاحمت کرتے کرتے نہ تھکتی تھی، خاور نے دانت نکالے۔ اس کے ہاتھ، بازو، آنکھیں بے جان، ساکت اور جذبات سے عاری تھیں، ایسا لگ رہا تھا وہ مردہ ہو یا چابی سے چلنے والی کوئی گڑیا ہو۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی اور وہ سامنے بیٹھا اسے گناہ گار نگاہوں سے تاڑ رہا تھا۔ خاور نے غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ اجالا کے جسم کے انگوں کے آکار پر کار کافی حد تک بدل چکے ہیں۔ چھاتیاں پہلے سے زیادہ سندر لگ رہی ہیں اور نظریں پہلے سے زیادہ قاتل۔ اس کے جسم کا درجہ حرارت کافی حد تک بڑھ گیا۔

’’مجھے بہت سُونا سُونا لگتا ہے یہاں، ویرانی ویرانی سی ہے، میرے بہت سے دوست ہیں جو کہتے ہیں مجھ سے کہ......‘‘ وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور اجالا بھی خاموش رہی۔ اسے شاید لگا ہوگا کہ اجالا پوچھے گی کیا؟ مگر وہ خاموش اپنی جھولی کی طرف دیکھتی رہی۔

’’کہتے ہیں مجھ سے کہ......آپ کے یہاں کوئی بچہ کیوں نہیں؟‘‘ اجالا گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

’’اس جیسے سُونے سُونے پن کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے......بچے!......بچے ہوں گی تو کتنا ہنگامہ رہے گا یہاں، کتنی خوشیاں آ جائیں گی یہاں............کیوں؟‘‘

اجالا کو دوبارہ چپ دیکھ کر اسے بہت غصہ آیا۔ جی میں آیا کہ لگائے دو جھاپڑ گال کے نیچے! مگر صبر کر گیا۔

اجالا کو ہلکے ہلکے چکر آنے لگے اور سینا غیر ارادا تن سکڑنے لگا۔

خاور میاں نے اسے ہاں سمجھ لیا۔ کان لال ہوئے تو اس نے کف کے بٹن کھولتے ہوئے حکم دیا؛ ’’دروازے کو چٹخنی چڑھا دو!‘‘ بے اختیار وہ گھبرائی۔ اس کا میاں ہی تو ہے۔ دوسری لڑکیاں کیسے خوش ہوتی ہیں جب ان خاوند واپس آتے ہیں پر اسے تو گھن آتی ہے خاور سے۔ جان نکلتی ہے اس سے۔ اس کو ضرور اب تک خاور سے محبت ہوگئی ہوتی اگر خاور کے کرتوتوں کی پول نہ اس کے سامنے کھل گئی ہوتی۔ کئی بار اس نے خاور کو اتفاق رنڈیوں سے باتیں کرتے سن لیا تھا۔ وہ گالیاں، وہ تعریفیں، وہ کھلم کھلا جسم کی باتیں کرنا۔ اس کو سن کر غصہ نہیں آیا تھا بس بے بسی سی محسوس ہوئی، محبت اور پست ہوگئی اور خاور کی عزت کرنا اور ہاتھوں سے نکل گیا۔

خاور کی نظروں کی تپش نا برداشت کرتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ دروازے پر چٹخنی چڑھا دی۔ پلٹی ہی تھی کہ خاور اسے بازو سے پکڑ کر پلنگ کے پاس لے گیا جس کے ایک کونے پر سبز رنگ کی جائے

نماز پڑی تھی۔ اجالا کا دل پاگلوں کی طرح دھڑکنے لگا اور ہونٹ کانپنے لگے۔ اس کے کندھے بے حد کس گئے۔ دفعتاً کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

خاور میاں نے سرخ منہ لیے جب دروازہ کھولا تو سامنے نواز اور نمرہ آپا کو پایا...... جاہل کہیں کے۔ وہ دل ہی دل میں چلایا۔ وہ دونوں بے انتہا خوش لگ رہے تھے باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''کیا بات ہے؟'' انہیں خاموش پا کر اس نے پوچھا۔

''بھائی، کمال الدین صاحب آ رہے ہیں، ایک دو دن میں، ہے نا جشن منانے کی بات'' نواز پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا جبکہ نمرہ چیخ چیخ کہہ اعلان کر رہی تھی۔

وہ تھوڑا سا مسکرایا اور کہنے لگا: ''ہاں ہے جشن منانے کی بات......'' اس نے اجالا کو مڑ کر دیکھا۔ وہ سہمی ہوئی باہر چلی گئی۔

نہ جانے رات ہوتے ہی خاور میاں گھر سے نکل گئے۔ اجالا کو بتایا تک نہیں اور جب بڑی ماں نے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے ایسے ہی کہہ دیا کہ کسی دوست کے گھر گئے ہوئے ہیں۔ وہ پوری رات نہ لوٹا۔

☆☆☆

''کچھ بتاتے کیوں نہیں؟'' گیلی زمین پر بکھرے پتے بارش میں نہا رہے تھے۔ وہ دونوں کتنی دیر خاموش رہے۔

''کچھ پتہ نہیں اس لیے'' آسمان اچانک زیادہ آنسو بہانے لگا اور پتوں کی چیخ و پکار اور زیادہ ہو گئی۔

''کچھ کیوں پتہ نہیں'' روہت کہنے لگا۔

''کیا؟''

''بندر کی جوں! بتاو، کچھ کیوں پتہ نہیں، کریں کیا اب؟''

اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر منہ میں ڈالا اور ماچس جیبوں میں تلاشنے لگا۔ نہیں ملی...... روہت ایک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ ابھی کچھ کہے گا۔

جب اسے جواب نہیں ملا اور آنند کو ماچس نہیں ملی، وہ بپھر کر بولا: ''ڈر نہیں لگ رہا؟''

''جہاں پیار ہو، وہاں بھئے نہیں ہوتا''۔ آنند سگریٹ منہ سے نکال کر جیب میں ٹھونستے ہوئے کہنے لگا۔

''نہ ملی تو......'' روہت بولا۔ آنند نے بارش میں ہاتھ کیا اور چند قطرے اس کی شرٹ پر گرے۔

''بارش رکتی ہے اور میں جاتا ہوں وہاں''۔ آنند مسکرا کر بولا اور روہت خاموش ہو گیا۔ اچانک انہیں وجے کے ساتھ ایک ڈرائیور مکلینک کے پاس جاتے دیکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے ایک لڑکی آئی............ گلشن!

☆☆☆

تین چار بجے وہ لوٹ آیا وہاں سے جہاں وہ گیا تھا۔ اس نے بتایا نہیں کہ کہاں گیا تھا اور اجالا نے پوچھا بھی

نہیں لیکن اس کو دیکھنے پر اجالا کو شبہ ہوا کہ جیسے کسی نے نچوڑ لیا ہو اسے۔ وہ بالکونی میں بیٹھی تھی بڑی ماں کے ساتھ۔ لان میں نواز اور خاور میاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور ساتھ ساتھ چائے کا دور چل رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے جھانک کر دیکھا نواز کی میٹھی میٹھی نظریں اس سے ٹکرائیں۔ وہ پلٹ آئی۔

''کیا بات ہے، رے نگوڑی؟ ایں! میرے سر پر کیوں کھڑی ہے جا اپنے میاں کے پاس، تاش واش کھیل، وقت بِتا اس کے ساتھ، ایں؟ خی غی...... غی خی'' بڑی ماں ہنس کر بولیں اور تسبی کھٹکھٹاتی رہیں۔

وہ بولی ہی تھی کہ بڑی ماں نے ایک اور سوال پوچھ لیا؛ ''وہ کہاں گئی تیری سہیلی قطامہ؟''

''گلشن؟''

''وہاں وہی نگوڑی!''

''کہہ کر گئی تھی کہ آئے گی آج شام، گھر دور نہیں اسکا، پاس ہی ہے''

بڑی ماں ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگیں۔ پھر پوچھا: ''اچھا لگ رہا ہے ڈوبتے سورج کو دیکھ کر، ہے نا''

''جی، اچھا لگ رہا ہے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ کر''

دونوں نے گیٹ سے گھستی گلشن کو دیکھا۔ اس نے اندر آ کر تاش کھیلنے والوں کو سلام کیا اور اندر چلی آئی۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف گئی۔ گلشن کی مٹھی میں کاغذ بھنچا ہوا تھا۔ نظریں ہچکچاتی ہوئیں آس پاس کے پڑے پھولدانوں میں سے نکلتی مہک کو تلاش رہی تھیں پر نا کام رہیں۔ اس نے آج کا چھک کر سلام کیا نہ سہی سے ملی، اکھڑی اکھڑی سانسیں لیے اجالا کا ہاتھ کس کے پکڑ کر اندر اس کے کمرے کی طرف دھکیلتی ہوئی چلی گئی۔ ہاتھ بے حد ٹھنڈے تھے۔ شدت میں اضافہ ہو رہا ہے، موسم کی بھی اور ان کی زندگی کی بھی۔

وہ پلنگ پر بیٹھ کر اس کا اسے کاغذ کے بارے میں بتانے کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے پہلے دروازہ بند کیا پھر اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ کر چٹھی کو کھولا اور بولی؛

''مجھے نہیں معلوم کیا لکھا ہے، جلدی پڑھو''

''ہاہا...... کس نے لکھی ہے؟'' اجالا نے ہنس کر پوچھا۔

''آنند کا خط ہے...... آنند کا!'' یہ الفاظ کتنی آسانی سے کہہ دیئے گئے تھے، ایسا نام پہلی بار سنتے ہوئے بھی اسے لگا جیسے وہ برسوں سے آنند کو جانتی ہے اس نام کا انتظار کرتی رہی اور یہ شاید وہی نام تھا جو راتوں کو بڑبڑایا کرتی تھی۔ یہ وہی نام ہوگا یہ وہی نام ہوگا۔

اس کی زبان بند رہی، اور باہر چنبیلی کے پھولوں کی مہک اچانک زیادہ ہوگئی۔ دودھ کی طرح سفید کاغذ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی رہی اور اسکا دل پسلیوں سے دیوانہ وار ٹکراتا رہا۔

''میں نے تو اسے دیکھا ہوا بھی نہیں تھا مگر اسے پہلی بار دیکھتے ہی...... معلوم نہیں تمہاری یاد آ گئی

......اس کے دوست نے ڈرائیور کو پہچان لیا......ڈرائیور سے انہوں نے تمہارے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی......میں نے سن لیا اور اب......''

''اور اب......''

''اور اب وہ اور اس کا دوست باہر گلی کے نکڑ پر کھڑے ہیں، کہتا ہے کہ جب تک جواب نہیں ملے گا وہ نہیں جائے گا'' گلشن نے مسکرا کر کہا اور اجالا ہنس پڑی۔ دل پگھل رہا تھا، گھبراہٹ سے، چنبیلی کی مہک سے اور اس چٹھی سے۔

''پڑھو......'' گلشن نے خوش ہو کر کہا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا؛

اجالا! میری زندگی کا اجالا، آپ کے قرب میں رہنا قبول ہے چاہے اس میں
میں جل بھی جاؤں، شاید آپ کو مجھ سے اتنا پیار نہیں جتنا مجھے ہے، آپ کو پانے کے
لیے ان کانٹوں بھری راہوں سے نہیں ڈرتا جن پر چلنے سے شاید مر بھی جاؤں،
ہم نے کل ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا تھا تب سے اب ہزاروں سال گزرے ہیں
اور میں نے آپ کو لاکھوں بار دیکھا ہے، آپ کی ان بے قرار آنکھوں میں ڈوبا ہوں،
اور ان بے قرار آنکھوں نے میرا اقرار لوٹا ہے، میرا............

دفعتاً دروازہ ٹھاہ کی آواز سے کھلا اور خاور اندر داخل ہوا۔ پیچھے نواز تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت و غصے سے پھٹی ہوئی تھیں اور نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ خاور نے زور سے اس کے ہاتھ سے چٹھی چھین لی اور جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ خاور کے جسم سے غصے کے شرارے پھوٹتے رہے۔ اجالا زور زور سے سانس لینی لگی اور جسم بے اختیار کانپنے لگا۔ چہرہ لال سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے گلشن کا ہاتھ کانپتے ہوئے تھام لیا۔ وہ دوڑتا ہوا باہر کی طرف لپکا اور نواز دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر اسے گلشن کے ساتھ سسکتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا جیسے اس نے خاور کو ان کی باتیں سننے کا مشورہ دے کر غلطی کی!۔

☆☆☆

اسے کوئی آدمی آتا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں پستول تھی۔ دیکھنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت ہی غصے میں آرہا ہے اور اسے ہی مارنے آرہا ہے۔ روہت نے پلٹ کر آنند کی طرف دیکھا۔ وہ کونے میں بیٹھی ایک سات سال کی بچی سے ہنس ہنس کر بات کر رہا تھا۔ اچانک وہ آدمی دوڑنے لگا......وہ بہت قریب پہنچ گیا۔

''آنند، آنند!'' اس نے کسی قدر چیخ کر کہا اس سے پہلے کہ آنند واپس دیکھتا، گولی چلنے کی

آواز آئی۔ گولی روہت کی کھوپڑی چیرتی ہوئی دماغ میں سے گزر گئی...... مزید تین گولیاں چلیں، تینوں کی تینوں منہ پہ......

آنند بوکھلا کر اس کی طرف بڑھا، کونے میں بیٹھی وہ سات سالہ بچی بلک بلک کر رونے لگی۔ خاور کی آنکھیں آنند پر ٹھہرتے ہی حیرت اور نفرت سے چوڑی ہو گئیں۔ اس نے پستول کی نالی کا رخ اس کی طرف موڑا۔ لیکن گولی چلنے سے پہلے کسی نے پستول کا رخ موڑ دیا...........نواز!

''یہ کیا کر رہے ہیں! یہ کیا کر دیا آپ نے، اف خدا یہ کیا کر دیا آپ نے بھائی، کیسے، افوہ'' نواز چلاتا ہوا اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے لگا مگر اس نے نواز کو زناٹے دار دھکا دیا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ پستول کی نالی ایک بار پھر آنند کی طرف مڑی اور پھر............

اس بچی نے ریت کی مٹھی خاور کی آنکھوں میں پھینکی۔ وہ چلا چلا کر گالیاں دیتا اپنی آنکھیں ملنے لگا اور آنند نے پاس کونے میں پڑی اینٹ اٹھالی اور اس پر جھپٹا۔ خاور نیچے گر گیا۔ تین اندھی گولیاں چلیں، جن میں سے ایک اس بچی کے ننھے سینے میں اتر گئی۔ آنند دھڑا دھڑ اینٹ اس کی سر میں مار رہا تھا...........ناک ٹوٹنے اور دانت ٹوٹنے کی آوازیں پہلے آئیں...... وہ اینٹ مارتا رہا اور مارتا رہا یہاں تک کے خاور کا بھیجا باہر نکل آیا اور اینٹ مکمل طور پر سرخ ہو گئی۔

وہ روہت کا سر اپنی گود میں رکھ کر کافی دیر آنسو بہاتا رہا۔

چوتھا باب

......خزاں کے بعد......

پھولدان کی ہری پتیاں دھوپ میں نہا رہی تھیں اور کمرے کی خاموشی گھڑی کی ٹک ٹک سے ہم کلام تھی۔ بادلوں نے سورج کی آنکھوں پر چند لمحوں کے لیے ہاتھ رکھا لیکن سورج نے ہاتھ ہٹائے اور پھر تیر چلانے شروع کر دیئے اور پھولدان کی ہری پتیاں پھر سے دھوپ میں نہانے لگیں۔

پچھلے کافی دیر سے وہ میز پر بازو ٹکائے کھڑا تھا۔ اس کی وردی ویسی کی ویسی تھی جیسے اس کو پسند آتی ہے۔ نیٹ اینڈ کلین، ٹائیٹ اینڈ شارپ۔ فون بجنے لگا اس دھیان لاہور سے گھومتا ہوا واپس اس کے آفیس آ گیا۔

''کچھ پتہ چلا، کچھ.....تو پتہ کرو نا!!! یو ایڈیٹس مجھے وہ مردہ چاہیے مردہ! سمجھے تم، ڈیڈ اور صرف اور صرف ڈیڈ، صرف چند گھنٹے ہیں تمہارے پاس، ورنہ یو آر فائرڈ!'' اس نے فون پٹخا اور گہری گہری سانس کھینچنے لگا۔ ٹیبل پر سے ریوالور اٹھا کر دیکھا۔ ریوالور رکھ کر وہ دھیرے دھیرے اس کونے میں چلا گیا جہاں اس کے بیٹے کی تصویر لگی تھی۔ خاور تصویر میں دو تین اور افسروں کے ساتھ میز پر بیٹھا تھا۔ دو کوکا کولا کی بوتلیں پڑی تھیں پاس ہی۔ کوئی پارٹی تھی، سب کے گلاس ہوا میں بلند تھے، یہ تو سب ہی اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان گلاسوں میں کوکا کولا نہیں تھی، تھی تو رم یا وسکی۔

چہرے پر نحیف سی اداسی لیے وہ تصویر کو چھونے لگا، لیکن آدھے راستے میں ہی رک کر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

''تمہارا بدلہ میں ضرور لوں گا، چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی حد سے گزرنا پڑے'' ٹیلیفون کی گھنٹی پھر سے بجی۔

''یس! ہاں ہاں، آئی ٹولڈ یو.... مردہ اور صرف مردہ، جلد سے جلد.... ہاں اور میرے ساتھ بھی، میں اسی وقت جا رہا ہوں وہاں'' میجر جنرل کمال الدین تصویر پر سرسری سی ڈالتا ہوا باہر نکل گیا جہاں دس بارہ فوجی کھڑے تھے۔

☆☆☆

نوکر دیکھتے کہ نمرہ نے گھر رو رو کر سر پر اٹھا رکھا ہے اور بڑی ماں کی دیکھنے کی طاقت اور بھی کمزور ہو گئی ہے ترچھی چال کی کم فہم اکھڑ نوکرانیاں یہی سمجھتی ہوں گی کہ ماضی کا کوئی پاپ ہے جو یہ مصیبت لایا۔

بہت لوگ آئے اور چپ بیٹھے رہے۔ نواز ٹیلیفون پہ ٹیلیفون پکڑتا اور اگر وہ دیکھتا...... کہ بڑی ماں کی آنکھیں، نمرہ کی آہیں اور اجالا کی سسکیاں وقت وقت کے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ مگر وہ مصروف تھا، مصروف رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گلشن کے پلے ساروں کو سہارا دینے کا کام تھا۔ وہ یہ امید جوڑتی کہ یہ سارا مسئلہ ختم کیا جا رہا ہے، ابھی کوئی افسر آنند کو گھسیٹتا ہوا لے کر آئے گا اور ایک گولی چلے گی...... زوردار گولی!...... جیسی اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی............

وہ تھک ہار کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے بائیں کان کے بیہ پر انگلی پھیرتے ہوئے اجالا کو دیکھنی لگی۔ باہر سے پولیس گاڑی کے سائرن کی آواز آئی۔

''پولیس اپنے ساتھ اپنے خاص بندے بھی لائی ہے'' اس نے کھڑکی سے دیکھا تو اجالا کو خبر کی۔ اسے دیکھنے پر احساس ہوتا جیسے اس پر رنڈاپا ٹوٹ کر گرا ہے۔ بنجر آنکھیں...... کھوکھلے ہونٹ جن کا رنگ اب ہلکا نیلا ہو رہا ہے اور ماتھے پر پھسلی ہوئی بالوں کی لٹیں...... نہ جانے گھر والوں کو حقیقت کا پتہ چلے گا تو کیا ہوگا ان آنکھوں کے ساتھ...... ان ہونٹوں، ماتھے پہ پھسلی ان بالوں کی لٹوں کے ساتھ...... ابھی تک تو نواز چپ ہے مگر جب منہ کھولے گا تو گینڈے کی طرح کھولے گا...... تب کیا ہوگا............

''دیکھو کیا انجام ہوتا ہے......'' اجالا نے پلنگ سے نکلے دھاگے چھانٹتے ہوئے کہا۔

''کہیں گے کہ تمہارا کوئی قصور نہیں اور نواز......''

اجالا نے اس کی بات کاٹی؛ ''میں اپنی نہیں اس کی بات کر رہی ہوں''

''تو تمہارے یہ آنسو؟''

''یہ آنسو مرنے والوں کے لیے نہیں ہیں گلشن...... یہ...... یہ تو ان کے لیے ہیں جو ابھی زندہ ہیں''

''چپ!...... چپ!'' گلشن اٹھ کر پاس بیٹھ گئی پلنگ پر۔

پھر بولی: ''گھر والوں نے سن تو کیا کہیں گے؟''

''کہیں گے کہ تم بے قصور نہیں، چھوڑیں گے نہیں تمہیں...... پیار جو کیا ہے، کسی سے عشق جو کیا ہے......اور اب جب عشق کیا ہے تو عذاب بھی بھگتنا پڑے گا تمہیں''

''گلشن!!'' باہر سے کسی نے آواز دی۔ وہ چلی گئی اور اجالا کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ ہلکی ہلکی روشنی آرہی تھی باہر سے۔

''آنند......آنند'' وہ بڑبڑائی۔

''بس! اجالا! بس! بہت ہو گیا......'' نواز بھنا کر اندر داخل ہوا۔

''......بہت چل گیا تمہارا یہ ناٹک......وہ قاتل! اس سے پیار کرتی ہو تم......وہ مجرم! جس نے پیٹھ دیکھائی ہے تمہیں اور بھاگ گیا ہے معلوم نہیں کہاں! وہ! اس سے محبت کرتی ہو تم......تم اتنی گر کیسے سکتی ہو اجالا......اور وہ لوگ جو تم سے پیار کرتے ہیں......ان کو تم پیٹھ دیکھاتی ہو؟......کیوں!''

اجالا سہمی سہمی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس نے سرگوشی کی: ''یہاں کسی کو نہیں معلوم کہ کیا کیا ہے تم نے......تم بے قصور ہو ان کی نظروں میں......اگر میں چاہوں تو دو لمحوں میں تمہیں یہاں سے چلتا کرواوں!'' اجالا نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور کچھ دیر خاموشی رہی۔

وہ نیچے جھک کر اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا اور نرمی سے بولا: ''اجالا، اجالا، اجالا......اے، ہش! ادھر دیکھو، میری طرف دیکھو......'' اس نے نرمی سے اس کا منہ اپنی طرف پھیرا۔

''پاگل تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ دوسرے دھرم کا ہے؟''

''وہ محبت جو دھرم بھی جان کر کی جائے......وہ کیسی محبت!''

''میں تم سے پیار کرتا ہوں......جتنا آنند سے تم پیار کرتی ہو اس سے کہیں زیادہ''

''تمہیں کیا پتہ نواز میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں؟''

''جان دے سکتی ہوں اس کے لیے؟............میں جان دے سکتا ہوں تمہارے لیے!''

وہ ہنس پڑی اور پھر روتے ہوئے بولی: ''جان......جان دینا چھوٹی بات ہے ان لوگوں کے لیے جن سے آپ خود سے زیادہ پیار کرتے ہوں......اصل غم......اصل چوٹ تو وہ ہے جو آپ کو زندگی بھر سسکا سسکا کر مارے......آپ کے پیار کو در دملتا رہے زندگی بھر اور آپ بس خون کے گھونٹ پیئیں اور بے بس رہیں......''

''تمہارے لیے یہ بھی کر سکتا ہوں'' اس نے تقریباً روتے ہوئے جواب دیا۔ اجالا چپ رہی۔

''کرلوں گا تمہارے لیے میں......کرلوں گا!'' نواز نے اجالا کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''جاو یہاں سے تم، دور ہو جاو مجھ سے!'' اجالا نے پیچھے ہو کر کہا۔

''پر بعد میں تمہیں میرے ہی قریب آنا......کمال الدین صاحب سے بات ہوئی میری...... یہ معملہ حل ہو جائے اس کے بعد تمہارا اور میرا نکاح ہو گا اجالا!'' باہر سے تھالی گرنے کی آواز آئی۔ نواز بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اجالا اپنے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔

''دِھیرج رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا!'' وہ یہ کہہ کر چلا گیا باہر جہاں گلشن دوسری طرف منہ کیے رو رہی تھی۔

☆☆☆

ٹیلیفون کافی دیر بجا۔

''کمال الدین صاحب کا نہ آیا ہو؟ انہوں نے کہا تھا کریں گے (فون)'' اس نے بڑبڑا کر فون اٹھا لیا۔

دوسری طرف اگر پولیس کا مشہور افسر نہ ہوتا تو وہ ضرور چھ سات موٹی موٹی گالیاں بکتا۔

''مل جائے گا وہ'' یہ سن کر اس نے فون رکھ دیا اور باہر کھڑے ملازموں کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ سارے تو بس چل رہے ہیں پھر رہے ہیں اور جی رہے ہیں...... پہلے کی طرح گائے بھینسوں کی زندگی۔ وہ خود کو بہلانے کے لیے سوچنے لگا۔ ابھی ان کی چھٹی ہوگی، گھر جائیں گے......نہیں! آج ان کی چھٹی دیر سے ہوگی یہ گھر پہنچیں گے تو ان کی بیویاں اپنے درجن بچوں کو کوٹنے کے بعد ان سے پوچھیں گی کہ اتنی دیر گئے کہاں سے آ رہے ہو؟......کوئی جواب ملا تو بیویاں جھوٹ سمجھیں گی اور اگر چپ رہے تو لازمی طور پر دال میں کچھ کالا ہے! پھر تو رات بھر جھاڑو اور چپلوں کے ساتھ وہ دھما چوکڑی ہوگی کہ ان بیچارے شوہروں کو گھر جانا پسند ہی نہ رہے گا، بس گلیوں میں آوارہ پھرتے رہیں گے، رات کو کسی کونے میں ایک کتے کے ساتھ پڑے پڑے سو جائیں گی! کتوں کے ساتھ رہنے سے یقیناً بیماری لگے گی اور جب بیماری لگے تو تب وہ گھر بیوی سے ملنے جائیں گے تاکہ اس کو بھی بیماری لگ جائے...... بدلے کا بدلہ، آزادی کی آزادی!

ہوا کہیں سے خون کی بو لائی۔ یہ کہاں سے آئی ہے؟ ضرور خاور کی لاش سے نکلی تھی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ اس کی لاش سے ان لاکھوں شراب کے گھونٹوں کی سرانڈ آئے گی جو وہ طوائفوں کے کوٹھوں پہ پیتا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی قتل کر کے، اپنا قتل ہوتے وقت شاید اس کو خیال آیا ہوگا۔ ممکن ہے آخری لمحے اس نے توبہ کی ہو....اس کے کرتوت پچھتائے ہوں گے۔ کرتوت....کون جانے کہ ان آخری اٹکتی سانسوں پہ کیا وہ پچھتائے؟

دنیا چھوڑتے وقت دل تڑپتا ہے، دل روتا ہے ان لوگوں کا، جن کا دل صرف دنیا میں ہوتا ہے....

اب اس سے سوال جواب ہو رہے ہیں...وہ روتا ہوگا، چلاتا ہوگا...کیا پتہ فرشتوں کو بھی رشوت دینے کی کوشش کرتا ہوگا۔

''کبھی تو ہم سب بھی مر جائیں گے، جس طرح اچانک دنیا میں آ گئے اسی طرح اچانک چلے بھی جائیں گے، اور جو زندہ ہوں گے ہمارے بعد...وہ بھی ہماری طرح، بچپن معصومیت میں، جوانی میں نادانیوں میں اور بڑھاپا پچھتاوئے میں گزارتے ہوئے ہمارے ساتھ مل جائیں گے!'' بڑی ماں نے نمرہ سے کہا جس کے گال ابھی تک پرنم تھے۔

☆☆☆

وہ شام اس کی زندگی کی بدترین شام تھی۔ وہ بہت روئی۔ دماغ پچھلے کئی گھنٹوں سے من لرزانے والے گمان لاتا آیا تھا۔

......کیا پتہ اب بھی ان دونوں کا ملاپ ممکن ہو......کیا پتہ اب ہی ان کا ملاپ ممکن ہو......

الہام ہوا!...... وہ زندہ ہے، سلامت ہے اور اس کی نظریں میری متلاشی ہیں۔

''اس طوفان میں بھی کیا اس کا دل میری طرف کشش کھا رہا ہوگا؟ کیا اب بھی ان خواہشات کی فہرست میں میرا نام اول آتا ہوگا؟'' اس نے آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو لیے تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔

پتہ نہیں......ابھی کوئی پولیس والے گشت لگائیں گے اور مجرم کو پکڑتے ہوئے لے جائیں گے......اور پھر......

اور پھر......کچھ بھی ہو، انصاف نہیں ہوگا!

اس کی ٹانگیں بے چین تھیں۔ ایک زخمی کبوتر کی طرح وہ تڑک رہی تھی۔ جسم پہلے بہت گرم تھا، بہت گرم، اب وہی جسم بے ٹھنڈا ہو گیا ہے اور بے انتہا پیاس لگتی ہے۔ جتنا پانی پی لو بجھتی ہی نہیں۔ کہیں دور سے کسی انگریزی گانا بجنے کی ہولی ہولی آواز آنے لگی:

"Cry maintained the jolting pain of loss

God avert the stinging sense of pause"

اسے بے اختیار رونا آ گیا۔

☆☆☆

شب بیداری میں کٹی۔ جاگ جاگ کر عصاب سخت پڑ گئے۔ دل بالکل جامد ہو گیا تھا جیسے کسی جالے نے اپنی لپیٹ میں لے کر سلا دیا ہو۔ اس نے سڑک کی طرف دیکھا۔ اکا دکا تانگے ہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پاس کی کسی مسجد میں اذان ہوئی ہے اور دور کھمبے کے پاس چند کتے ابھی سونے سے اٹھے ہیں اور بھونکنے کی کوشش

کرر ہے ہیں۔ جاڑا پوری رات سے اپنے پنجے سخت کرتا آیا تھا۔

''او! چنٹو! بھگ بھگ کے آ! جلدی'' سامنے کی ایک بلڈنگ کے سامنے دو بھنگی جھاڑو لگا رہے تھے اور اپنے ساتھی کو پکار رہے تھے۔ وہ فٹ پاتھ پر ایک بلی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

میاوں......میاوں...... بلی اس کے پیروں کے ساتھ اپنا منہ رگڑنے لگی جیسے پیار کر رہی ہو۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ دفعتاً پولیس کی سامنے سے آتی دکھائی دی۔ وہ تھوڑا سا بوکھلایا۔ گاڑی ان بھنگیوں کے سامنے رکی۔ وہ ایک پرچہ دیکھا کر کچھ پوچھ رہے تھے یقیناً اس کے چہرے کا نقشہ ہوگا۔ ایک بھنگی نے زور زور سے سر ہلایا اور الٹی طرف اشارہ کیا۔

سارے پولیس والے گاڑی میں لپکے اور گاڑی کلکاریاں بھرتی گھڑی بھر میں غائب ہوگئی۔ کچھ دیر وہ چپ بیٹھا رہا، روہت کے خیال آتے رہے، اب وجئے کے بھی آنے لگے تھے۔

وہ اٹھ کر ان بھنگیوں کے پاس گیا۔ جھاڑو لگانا بند ہو چکا تھا اور چائے کا دور دورہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک درخت کے نیچے تینوں بیٹھے گندی کچندی پیالوں میں خون جیسی لال چائے پی رہے تھے...... چائے ہی تھی۔ تینوں نے نظر بھر اس کو دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف پھر اس رہ کر طرف جہاں پولیس کی گاڑی گئی تھی پھر دوبارہ اس کی طرف اور پھر ایک دوسرے کی طرف۔

اس نے یہ سلسلہ توڑنے کے لیے پوچھا؛ ''کیا پوچھتے تھے پولیس والے؟''

''کا؟'' تینوں نے ایک ہی لہجے میں چنگھاڑ کر کہا۔

''کیا پوچھتے تھے؟''

''کچھ ناہی پوچھتے تھے ساب، تم بیٹھو چائے پیو! میں ابھی آیا'' ایک بھنگی بولا، باقی دونوں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔ وہ دونوں سمجھ گئے۔

فوراً آنند کو پکڑ کر پاس بیٹھا دیا۔ ایک تو مسلسل اسے گھور رہا تھا......وہ پرچہ!...... اسے یاد آیا۔

''میں جاتا ہوں!'' اس نے اٹھنا چاہا لیکن بھنگی نے بازو سے پکڑ لیا۔

''کدھر جاتا ہے ساب!'' دوسرا بھنگی نے چلا کر جیب سے چاقو نکال لی۔ آنند نے زناٹے دار دھکا دیا اور خود کو چھڑا کر بھاگنے لگا۔ ایک اس کے پیچھے دوڑنے لگا اور دوسرا چلا چلا کر کسی دوسری زبان میں کچھ کہنے لگا۔ وہ دوڑتا رہا اور دوڑتا رہا اور پلٹ کر نہیں دیکھا۔

جب پھیپھڑوں سے ہوا ختم ہوگئی تو وہ رکا اور مڑ کر دیکھا۔ وہ بھنگی ابھی تک چاقو لیے دوڑتا ہوا آ رہا تھا!

☆☆☆

اس نے دیکھا کہ گھڑی کل شام سے رکی ہوئی ہے۔ اس کی سوئیاں ٹک ٹک تو کر رہی ہیں مگر آگے نہیں بڑھ

رہیں بس اپنی جگہ موجود ہیں، وہیں آگے پیچھے ہوتی رہتیں ہیں، بھلا ایسی گھڑی کا کیا فائدہ۔

''کل شام سے بند ہے'' اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کر کے چاچا سے کہا جو گھٹنوں میں سر دیئے، بیڑی پیتے ہوئے دھواں اڑا رہا تھا۔ جواب میں سر کی جنبش ملی۔ گھڑی پر دھول کا ناصاف پردہ چڑھ چکا ہے لیکن اس گدلے پردے پر تین انگلیوں کے نشان سبط ہیں......روہت کی انگلیاں......

اس نے پہنچان لیا۔ روہت کی انگلیاں ایسی ہی نظر آتی ہیں، نہ جانے اب وہ کہاں ہیں۔

''پتہ ہے......'' چاچا نے اپنی دھنک جیسی ابروں کو سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا؟''

''جب جب یہ گھڑی رکتی ہے تب تب کوئی مصیبت آتی ہے'' چاچا منمنایا۔

''ہاہا، میں نہیں مانتا'' وجئے ہنس پڑا۔

''کیا مانتے ہو پھر؟'' چاچا نے اس کو ایک بیڑی دیتے ہوئے پوچھا۔

''کہ جب جب کوئی مصیبت آتی ہے تب تب یہ گھڑی رکتی ہے! ایسا لگتا ہے کہ وقت رک گیا! ایسا لگتا ہے زمانہ رک گیا! مگر چاچا! وقت بھی کبھی رکتا ہے! نہیں نہیں، نا نہیں!'' وہ بیڑی پیتے ہوئے بولا۔

''جوانی کے نشے میں کیسے چُور رہو تم......کسی زمانے میں ہم بھی تمہارے جیسے ہوتے تھے......''

''کیسے؟'' وجئے کو لگا کوئی تعریف ہو گی۔

''جاہل، بیوقوف، مکار!'' مٹر چاچا نے ایک ادا سے دھواں اڑا کر کہا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

''اکیلے کیسے رہ لیتے ہو؟''

''بھئی ہمارا کیا ہے، نا دھن ہے نا دھرم! قسمت میں اڑتے ہیں ہم ایک کٹی پتنگ کی طرح......''

وجئے کو ایسا لگا کہ چاچا کے ماتھے کی جھریاں مزید بڑھ گئی ہیں۔ اچانک پولیس کی گاڑیوں کی دھنکار سنائی دی، گاڑیاں ایک کتے کے سامنے رکیں اور ایک افسر گاڑی سے نکلا منہ میں ایک بڑا سا پان گھسیڑتے ہوئے۔

''دھُوت! دھت! ہٹ!'' افسر کے چیلے نے کتے کو ہاتھ سے چپل کا اشارہ کرتے ہوئے بھگایا، وہ دونوں کھڑے ہو گئے اور دیکھنے لگے۔

افسر ایک دم پھسپھسا سا آدمی ہے، دیکھنے پر عین ہاتھی جیسا نظر آتا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اپنے موٹے جسم پر اس نے دھوتر کپڑے سے بنی شرٹ پینٹ پہن رکھی ہے۔ بیڑی کے دھوانسے برآمدے میں وہ داخل ہوا اور کونے میں بکھرے غلط کپڑوں کو اپنی پدی پدی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

''جی؟'' چاچا نے سب کو چپ پایا تو پوچھا۔

''یہ آدمی......''افسر نے کہا اور ایک پولیس والا آنند کا سکیچ لے کر آگے بڑھا۔

''......نظر آیا کہیں؟'' وجئے اور چاچا ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے رہ گئے۔

''نہیں کوئی، کوئی وجہ؟''

''قتل کیا ہے اس نے!'' افسر نے اپنی انگلی کے رنگ برنگے چھلّے کو گھماتے ہوئے کہا۔ ان کے منہ سے جیسے زبان چھن گئی ہو اور چہرہ کا رنگ دِگرگُوں ہو گیا۔

''تم کیوں ٹھٹکتے ہو؟ اس علاقے میں دیکھا گیا تھا یہ کل......انعام ہے اس کو قتل کرنے پر ......نظر آئے تو مار ڈالنا......پورے پانسو ملیں گے''اس نے ہاتھ کو پھیلا کر بتایا۔ پولیس والے چلے گئے اور وہ ایک دوسرے کا منہ کافی دیر تکتے رہے۔

☆☆☆

کمال الدین نے اجالا کو صاف نظر انداز کر دیا۔ کئی گھنٹے وہ یہی سوچتی رہی کہ کوئی بات کریں گے آ کے اس سے لیکن وہ باہر ہی رہے۔ اندر آتے تو بڑی ماں اور نواز اور نمرہ سے بات چیت کر کے دوبارہ باہر چلے جاتے۔ وہ سویرے سویرے ہی آ گئے تھے۔ بیٹے کی موت کا پورا پورا غم تھا انہیں۔ جب جب وہ نواز کو ان کے آس پاس پھدکتا ہوا دیکھتی جی لرز اٹھتا۔ اس کو سننے میں آیا کہ کسی ہندو نے اس کے شوہر سے بٹوا چھیننے کی کوشش کی، جب نہیں دیا تو دے دی اس نے دماغ میں تین چار گولی......دھائیں! دھائیں! دھائیں! اور بٹوا لے کر بھاگ گیا کمبخت۔ گلشن نے اس کے ساتھ ہی تھی ایک دن سے۔ گلشن سو گئی دونوں راتیں لیکن وہ راتیں جاگتی رہی۔ سو بھی کیسے سکتی تھی۔ سونے کی کوشش کرتی تو ہڑبڑا کر اٹھ جاتی۔ بجلی پورے دو دن سے غائب تھی۔ موم بتی کی روشنی سے جو دیوار پر سائے بنتے تھے وہ سارے تبدیل ہو کر اور شکلوں میں رچ جاتے......کبھی کمال الدین......کبھی خاور......کبھی نواز............تو کبھی آنند!

ڈر کے مارے میں وہ موم بتی بجھا دیتی تو اور بھی زیادہ ڈر لگنے لگتا۔ ایسے ایسے خیال آتے کہ دل تڑپ اٹھتا اور کبھی کمرے میں خاور کی روح ہونے کا خدشا سر پر چڑھ کر ناچنے لگتا۔ وہ دوبارہ ڈر کے مارے موم بتی جلا دیتی اور اس بار صاف فیصلہ کرتی کہ اب کی باری موم بتی نہیں بجھائے گی۔

کھڑکیاں بن رہیں باہر سے آنے والے دھند کے بھبوکوں نے اس کو دھندلا دیا۔ اسی وجہ سے جب وہ کھڑکی سے باہر ٹہلنے والے ان لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کرتی تو باوجود آنکھیں سکیڑنے کے کچھ نظر نہ آتا۔ باہر جلتی روشنیوں کا ایک موٹا بھدا سا دائرہ نظر آتا......اور بس!

اذانیں ہوئیں اس نے نماز پڑھ لی اور یہ امید لگا کر ٹک گئی کہ سورج جلدی نکل

آئے۔ساڑھے سات بج گئے اور سورج نہ نکلا۔عنقریب سورج کو نکلنا تھا مگر باہر دھند بڑھ گئی اور سورج غیر حاظر رہا۔وہ بہت دیر کمرے کے اندر ٹہلتی رہی اور گلشن کو سوتے ہوئے دیکھتی رہی۔نمرہ آپا کا کمرہ تھا وہ۔نہ جانے رات ہوتے ہی انہوں نے کہہ دیا تھا کہ تم دونوں اوپر چلے جاو میرے کمرے میں......

کتنی سہلیاں آئی تھیں اس کی،وہ یاد نہ کر پا رہی تھی......وہ یاد کرنے کی کوشش کرتی اور آٹھ کے ہندسے پر وہ رک جاتی......شاید اس لیے کہ اس کی سہیلیاں آٹھ سے زیادہ تھیں ہی نہیں۔

اچانک اس کو کہیں دور سے کویل کے گانے کی آواز سنائی دینے لگی......کویل اور نومبر میں؟ کویل تو آموں کے موسم میں آیا کرتی ہے۔کیا یہ صرف میرا وہم ہے کیا میں......؟ وہ اتنا بڑبڑا کر خاموش ہوگئی۔

اس نے اپنی دائیں آنکھ کے کوئے کو تھوڑا سا رگڑا اور کھڑکی ذرا سی کھولی اور باہر جھانکا۔

ٹھنڈی ہوا اور موٹی دھند کی چادریں......کھڑکی اس نے بند کردی۔

اسی وقت دو کویلوں کے گنگنانے کی آواز آنے لگی اور اس کے بعد تین کویلیں......چار......شاید......

پھر سے تین ہوگئیں......اب دو باقی رہ گئی......اب صرف ایک......اور اسکے بعد بالکل خاموشی چھا گئی......

☆☆☆

''اور جھوٹ کیوں بولوں گا آپ سے......بس......یہی قصہ ہے سارا......'' وہ کہتے ہوئے آہستہ آہستہ اگے میز کی طرف جھک گیا۔باہر سے آتا شور پہلے کی طرح روانی سے آرہا تھا۔

''کُجا؟(کس جگہ)''

''گھر کے باہر گلی کے نکڑ پر''اس نے گہری سانس لی۔باہر کوئی کہرام مچا کوئی قیامت ٹوٹی۔لوگ چلا کر خاموش ہوگئے۔کمال الدین سوچ میں پڑے اور وہ میز پر پڑے گلوب کی طرف دھیان سے دیکھنے لگا۔اس کے بعد اس کی نظر ان کے چہرے پر پڑی۔وہ میز پر کونیوں کی تلون بنائے بیٹھے تھے۔

نواز نے غور کیا......ابرو اور کان کتنے ملتے ہیں ہمارے،اور بال......ماتھا ان کا بھی بالکل صاف ہے،بال ان کے سفید لیکن میرے سیاہ ہیں......ہاں! بیچ بیچ میں کچھ سفید بھی ہیں پر کیا کریں،اندھیری ترین راتوں میں بھی اکا دکا تارے تو ہوتے ہیں......گال ان کے تھوڑے اندر کو دھنسے ہیں،کنپٹیاں بھی عجیب سی لگتی ہیں،اور ان کی آنکھیں......سخت بے جان آنکھیں! کوئی رمق نہیں! کوئی روشنی نہیں! کوئی غم کوئی خوشی کوئی جذبا نہیں! ان آنکھوں کو کوئی فتح نہیں کرسکتا......کیا پتہ یہ آنکھیں اگر سچ جان لینے پر مجھ پر تیر برسانے لگیں مجھے اجنبی نظروں سے دیکھنے لگیں......تو میرا کیا ہوگا؟......رشتے کا کیا ہوگا؟......نہیں مجھے بتا دینا چاہے سچ انہیں کیا ہوگا......ہاں! کہیں اجالا کو یہ جان سے نہ ماردیں! نہیں! نہیں! ایک چپ سو سکھ!

''پانی پلاؤ!'' وہ اپنے جبڑے کو تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ کرسی پر ٹیک لگا دی اور چھت کو گھورنے لگے۔ سفید چھت جس پر الگ الگ رنگوں کے دھبے خوبصورتی بڑھانے کے لیے بنائے گئے تھے لیکن وہ ایسے تھے جن سے سادہ انسانوں کو چڑ ہوگی، کیسے وہ رنگ رنگ کے دھبے سیدھے سادھے سفید رنگ کی خوبصورتی بگاڑ رہے ہیں......کتنا اچھا ہوتا اگر یہ بدنما داغ اس چھت پر نہ ہوتے۔

''پانی!'' وہ چونک پڑے۔ نواز نے گلاس سامنے رکھ دیا۔ بڑے بڑے چار گھونٹوں میں وہ پورا کا پورا گلاس خالی کر گئے اور واپس کرسی پر ٹیک لگا کر اپنے ٹھنڈے جھریوں سے بھرے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے چھت کو تکنے لگے۔ پاس کی الماری میں کلاسک گانوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ نیچے کے حصے میں بہت سے کپ ٹرافیز پڑی تھیں......سکول کی تھیں......تیسری جماعت فرسٹ......چوتھی جماعت فرسٹ...... پانچویں جماعت فرسٹ......دس ٹرافیز تھیں کالج کے اختتام تک۔

''دادا جان کیا سوچا ہے آپ نے پھر؟'' اس نے نہایت مستند لہجے میں پوچھا۔

''کس بارے میں......''

''میں کس بارے میں پوچھوں گا آپ سے......'' یہ سن کر وہ تھوڑا سا ہنسے۔

''کہانی سناؤں ایک......''

وہ چڑ گیا کہنے لگا؛ ''میں کیا پوچھتا ہوں آپ سے اور......''

انہوں نے بات کاٹی ''کل!......کل کا ذکر ہے کہ نواز کا نکاح ہوا اجالا کے ساتھ''

''کل کلاں کو انکار کر دیا اس نے تو......''

''مجال ہے اس کی کہ انکار کرے!''

تھوڑی دیر بعد وہ مسکراتا ہوا ان کے پرانے آفس سے نکلا۔ اس کے نکلتے ہی بہت سے افسر دروازے کو لپکے۔ وہ سیدھا کلب چلا گیا اپنے دوستوں کے پاس۔ اس کے دوست تو سبھی جیسے وہیں کلب میں ہی رہتے تھے۔

''کل کا ذکر ہے کہ نواز کا نکاح ہوا اجالا سے......پھر......پھر بچے ہوئے نو دو گیارہ! ہاہا!''

راستے بھر میں وہ بڑبڑاتا رہا۔ نواز کو لگ رہا تھا کل کائنات اچھل رہی ہے خوشی سے۔ اس کے سامنے آنے والی گاڑیاں، تانگے جان بوجھ کے اس کے سامنے سے ہٹتے جا رہے ہیں کیونکہ آج اس کی زندگی کا سب سے اچھا دن ہے۔ کلب میں دوستوں کے ساتھ وہ کافی دیر تک شراب پیتا رہا......شعر کہتا رہا......اپنے دوستوں کی واہ! واہ! سنتا رہا اور جب اس کا اس سب سے جی بھر جاتا تو وہ دوسرے کمرے میں بیٹھی لڑکیوں کے قدموں میں بیٹھ جاتا۔ ان سے باتیں کرتا انہیں چھیڑتا۔ کھلم کھلا ان کے جسموں پر تبصرہ کرتا۔ اگر کوئی ناراضی کا اظہار

کرتی تو اسے پکڑتا ہوا دوسرے الگ کمرے میں لے جاتا اور اندر سے دروازہ بند کر کے......!

کلب سے کئی گھنٹوں بعد وہ نکلا۔ گاڑی وہیں رہی۔ وہ پیدل سڑکوں پر گھومتا رہا...... پھرتا رہا......

وہ مانگنے والے فقیر بچوں کو دور سے چلا چلا کر بلاتا اور جب وہ قریب آتے تو گالیاں دے دے کر بھگا دیتا، اور ہنستا زور زور سے...... اور کبھی کبھی تو ان کی تھالیوں میں موجود سکے چھیننے کی بھی کوشش کرتا۔

وہ بچے دم دبا کے بھاگ جاتے۔ اس نے کئی سگریٹوں کی کئی ڈبیاں پی ڈالیں۔ بہت گھنٹے گزر گئے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا گلشن سے ملے...... لیکن کیوں ملے...... وہ دوبارہ کلب چلا گیا۔

☆☆☆

جامن کے پیڑوں کے پار وہ دونوں کافی دیر باتیں کرتے رہے...... پھر خاموشی ٹک گئی دونوں کے بیچ۔

مٹی سے معلوم نہیں کیوں اتنی اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ شاید وہ گند اس تالاب میں موجود کنول کے پھولوں سے آ رہی ہوگی جو مٹیالے مٹیالے سے ہو رہے تھے۔ شنی چٹھی مل کر وہ پہلے تو بہت ڈری لیکن پھر چلی گئی...... جہاں اس نے بلایا تھا۔

کوئی دیر بعد وہ بولا: ''مٹی کے مول بیچ رہی ہو خود کو؟''

''اور کیا کر سکتی ہوں؟''

''مجھے کیوں نہیں دے دیتی اپنے آپ کو؟ اجالا تم...... تم اس گاہک کی مانند ہو جو چیزوں کے مول تو جانتا ہے...... لیکن انہیں خریدنے کی ہمت نہیں کر سکتا!'' اس نے روہت کی گھڑی اپنے ہاتھوں میں اچھالتے ہوئے کہا۔

''اور تم کیا ہو آنند؟...... تمہارے پاس ہمت ہے، سکے ہیں لیکن ان کی حیثیت نہیں جانتے'' آنند مسکرایا۔

تھوڑی دیر بعد بولا: ''وہ لڑکا......''

''نواز...... کہتے ہیں کہ نکاح ہوگا زبردستی کا، لیکن پہلے تمہیں ماریں گے''

''تم طوفان سے کیوں ڈرتی ہو!...... ہم ساتھ ساتھ ہوں گے تو کٹ جائے گا طوفان بھی!'' وہ جامن کے پیڑوں کو دیکھ رہی تھی جو تیز ہوا، تیز دھوپ اور ہلکی ہلکی خنکی میں جھوم رہے تھے۔

''ڈرتی نہیں ہوں...... ڈروں گی کیوں...... مگر میں مسلمان اور......''

''اور میں ہندو نہیں!'' اجالا نے گردن گھما کر اس کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دیکھیں۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیوں؟ کیا ہوا آخر؟...... وہ کچھ بول نہ پائی۔

''ہاں! ہاں! اجالا!...... میں آنند نہیں دانیال ہوں!''

''کیا؟ کیسے؟ تم تو......''

''انہوں!'' دانیال ہلکا سا مسکرایا اور گردن کو خم دے کر کنول کے پھولوں کو دیکھنے لگا۔

''پولیس کے پانچ آدمی تھے...... میں اکیلا!...... انہوں نے مجھے بہت مارا، بہت پیٹا، ساتھ لے جانے لگے لیکن پھر...... نہ جانے مجھ میں کیسی طاقت آ گئی...... میں گنڈاسا اٹھا کر ان پر ٹوٹ پڑا...... گولیاں چلائیں انہوں نے...... ایک لگی مجھ کو......'' اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اجالا نے غور کیا تو کپڑے کے پار کندھے پہ بندھی وہ پٹی نظر آ گئی۔

''زخمی تھا میں بہت...... بہت زیادہ!...... پورا زور لگا کر چلتا رہا گر جاتا پھر کھڑا ہو جاتا...... مسلسل خون رس رہا تھا...... کافی چلنے کے بعد جب آخری بار میں گرا تو میرے آنکھوں کے سامنے پردہ چھا گیا...... بے ہوش!...... ہاہا! پھر کسی نے مجھے اٹھایا! لے گئے اپنے ساتھ...... ایک عالم تھے وہ...... میں نہیں جانتا کون سے...... میں نے پوچھا ہی نہیں...... انہوں نے جب میرے بارے میں پوچھا تو میں ڈر گیا...... کہہ دیا کہ مسلمان ہوں، یہ سن کر وہ مسکرائے...... ان کی وہ مسکراہٹ! اجالا!...... میں جانتا تھا کہ وہ جانتے ہیں کہ میں مسلمان نہیں ہندو ہوں...... لیکن پھر بھی انہوں نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا...... تین دن! تین دن بعد مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے انہیں سچ بتا دیا...... ان کا سلوک اور بھی اچھا ہوگا! ہاہا! جیسے مجھے جھوٹ بولنے کا انعام مل رہا ہو!...... میں جانتا رہا تمہارے دین کے بارے میں...... اسلام کے بارے میں! دن رات!...... اور...... اور''

''اور تم مسلمان ہو گئے صرف اپنے لیے''

''اور میں مسلمان ہو گیا صرف اپنے لیے''

کافی دیر تیز ہوا چلتی رہی اور اس کے بال بکھرتے رہے۔

وہ بولا: ''حیرت کی بات ہے! مجھے لگا تھا جیسے وہ تمہارے ساتھ برا سلوک کریں گے''

''وہ کرتے! بھلا کیوں نہ کرتے! اگر ان کو سچ معلوم ہو گیا ہوتا تب''

''یہ کرم ہوا کیسے؟''

''یوں سمجھ لو جیسے جھوٹ بولنے کا انعام ملا ہے!''

''ہاہا! تم!...... جھوٹی!'' اس نے کہا اور دونوں ہنس پڑے۔

''نا میں نہیں...... نواز، نواز!''

''اچھا تو ایک اور پروانا بھی شمع پہ مرتا ہے!'' دانیال نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا اور اجالا کے بالوں کی ایک لٹ پھسل کر ماتھے پر بکھر گئی۔

اجالا نے نظریں اٹھائیں: ''پر شمع کو اس پروانے کی کوئی پروا نہیں! شمع کو تو اس پروانے کی پروا

ہے جس پہ وہ خود مرتی ہے!''

وہ اس کے بالوں کی لٹ میں ادھ چھپی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس نے دائیاں ہاتھ بڑھایا اور اس کی آنکھوں کو چھیڑنے والی گنہگار لٹ کو اس کی جگہ پر پہنچا دیا اور اجالا نے ہاتھ بڑھا کر اس کے دائیں گال کو چھوا۔ اور اس کو جیسے محسوس ہوا کہ گال گرم ہو رہے ہیں، تپتے ہوئے لال لال ہو رہے ہیں۔۔۔

''بہت دیر ہوگئی ہے...... میں جاتی ہوں آنند''

''آنند نہیں...... دانیال......'' دانیال ہنس پڑا۔

''او، ہاں!'' وہ مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''کہاں گئی نظر تو نہیں آ رہی'' وہ جامن کے پیڑوں کے پار گلشن کو ڈھونڈ نے لگا۔

''وہ ادھر ہے وہاں دیکھو'' وہ چلی گئی گلشن کے ساتھ۔ جاتے وقت اس نے اسے یہ کہتے نہ سنا کہ پھر ملیں گے۔ کہنے کو تو وہ اس سے ہر وقت ملتا تھا۔ اس کی ہر دھڑکن میں وہ مچلتی تھی اور وہ اس کے ساتھ ہر وقت رہتا تھا، اس کے پہلو میں......

وہ خالی راستے پہ چلتی جانے والی گاڑی کو دیکھتا رہا پھر وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ واپس پلٹ کر اسی بینچ پر آ بیٹھا۔ وہی بینچ تھا...... وہی مٹی کی خوشبو...... وہی کنول کے پھول تھے...... وہی ہوا، وہی دھوپ، وہی جامن کے پیڑ...... لیکن وہ، وہ پہلے جیسا نہ تھا اور بظاہر پہلے جیسی دیکھنے والی چیزیں بھی اسے پہلے جیسی نہیں دیکھائی دے رہی تھیں۔

کنول کا پھول اپنا رس کھو چکا تھا...... جامن کے پیڑ اپنا جھومنا بھول چکے تھے...... دھوپ اپنی تپش...... ہوا اپنی تازگی...... اور وہ مٹی اپنی گند، اپنی خوشبو...... کون جانے کہ وہ خوشبو مٹی کی تھی، کنول کے پھولوں کی یا اجالا کی۔

دفعتاً چار پانچ گاڑیاں ان پیڑوں کے پاس رکیں۔۔۔ پولیس!

نواز اور وجئے!...... وہ حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔

☆☆☆

جن لوگوں نے اسے پکڑا تھا وہ یقیناً رحم نہیں کرنے والے تھے۔ درد سے جسم کا جوڑ جوڑ چیخ رہا تھا۔ اس کی شرٹ آدھی پھٹ چکی تھی۔ وہ لال سرخ شرٹ اور اس پر وہ خون کے موٹے موٹے دھبے۔ اس نے ہاتھ بڑھانا چاہا...... لیکن ہاتھ بندھے ہیں پیچھے کرسی سے......

آس پاس کے سیاہ اندھیرے میں اوپر جلتی چیز کو دیکھا...... بڑا سا بلب...... آنکھیں چندھیا گئیں۔

وہ آنکھیں سکیڑ کر آس پاس دیکھنے لگا۔ وہ بتا سکتا تھا کوئی نہ کوئی تو کمرے میں موجود ہے......

وہ گھورتا رہا اندھیرے میں......ایک سایہ ہے!

نہیں دو سائے ہیں......نہیں تین سائے!!......تین ہی ہیں! اندھیرا کچھ کم ہو گیا۔

نواز......جنرل کمال الدین......اور وہ فوجی جلال جن، جس کے ایک ہاتھ میں درا تھا اور دوسرے میں بلیڈ۔ روشنی ڈم ہو گئی......ایک سائے نے دوسرے سائے کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی......

روشنی پھر تیز ہو گئی اور اس نے دیکھا کہ اس کے چہرے کے قریب کمال الدین کا چہرہ ہے، وہ اسے ٹکر ٹکر گھور رہا ہے۔ اسی وقت کمال الدین نے اس کے منہ تھوک دیا۔ چپچپی تھوک ابرو سے پھسل کر نیچے آنکھ میں جانے کی کوشش کرنے لگی۔

''یو بچ!'' اس بار تھوک گردن پر پڑی۔ وہ پھنکارتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ مدھم اندھیرے میں اس کو نواز کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھائی پڑ گیا۔

''یہ بکھیڑا بکھیر دے گا تمہیں، خود سے چمٹی جنجال محسوس ہو گی تمہیں اپنی زندگی!......آنند!''

دانیال مسکرایا۔ نواز غصے سے بڑھا اور ایک زناٹے دار مکا اس کے منہ پہ دے مارا۔

پورے جسم میں ایک درد کی لہر سی اٹھی اور مسوڑوں سے چبھنے والا خون نکلنے لگا۔ ہونٹ خون آلود ہو گئے۔ نواز اپنا مکا ہوا میں لہراتا ہوا واپس چلا گیا۔ کمال الدین پھر آگے آئے اور پیچھے سے کچھ نکالا۔۔۔ ریوالور!

''اپنی موت دیکھ لو......'' ریوالور کو اس کی آنکھوں کے سامنے سے وہ نچانے لگا۔ دانیال کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

کمال الدین نے اس کے دائیں گال پر زور کی چپت ماری۔ اس کے دماغ میں جیسے سوئیاں سی چبھنے لگیں اور اس کو جیسے محسوس ہوا کہ گال گرم ہو رہے ہیں، تپتے ہوئے لال لال ہو رہے ہیں۔۔

وہ دوبارہ ریوالور کو اس کی آنکھوں کے سامنے نچانے لگا۔

''اب پینتیس منٹ ہیں......پینتیس!......پینتیس!......چالیس منٹ ہونے سے پہلے تم اس دنیا میں نہیں ہو گے، روح کہیں اور ہو گی......جسم یہیں ہو گا......ہم گدھوں کو کھلائیں گے، کتے تمہارا گوشت پسند نہیں کریں گے ہاہا! ہے نا نواز! ہاہا!..........تم بے حس نہیں! کیا موت سے ڈر نہیں لگ رہا؟''

''کون منحوس محبت کرنے کے بعد بھی اپنی موت سے ڈرتا ہے!......میرا دل رحم مسلتا ہے ایسے منحوسوں کے لیے!......مسلسل روتا ہے ایسے محبت کرنے والوں کے لیے......مسند آرا ہو جو تمہارے دل پہ، مرنے میں بھی کیا ڈر ہوا گر مرنا ہو ان کے لیے......ان کے لیے!......ہا! تم! تم! نواز کیسے مسکین ہو تم! کہ تمہیں پتہ ہی نہیں کہ وہ تمہاری کبھی نہیں ہو سکتی! نا کبھی بھی نہیں! تم نکاح کرو گے تو اس کے ساتھ جس کی ساری محبتیں میرے لیے ہیں......تم راتیں گزارو گے تو ان آہوں کے ساتھ جو میرے لیے ہیں......تم جیو گے اس کے

ساتھ جس کے دل میں مچلتے سپنے صرف میرے لیے ہیں! صرف میرے سپنے ہیں!......''

''یو باسٹرڈ!'' کمال الدین نے تیزی سے ریوالور کا رخ اس کے ماتھے کر طرف کیا۔

''نہیں!'' نواز نے گولی چلنے سے پہلے ریوالور کا رخ تبدیل کر دیا۔ گولی جھولتے بلب کی تار کو چھو کے نکل گئی۔ بلب ہلنے لگا۔ روشنی ہلنے سی لگی۔

''آر یو میڈ! یہ کیوں کیا؟'' کمال الدین غرایا۔

''نا جنرل! نا!......اس کی سزا کچھ اور ہے......اس سے بھی بد تر ہے! اس سے بھی بری ہے!''

''اس سے کیا سزا بری ہے؟'' کمال الدین نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ نواز ٹہلتے ہوئے ہنسنے لگا۔

''جان دیتے ہوئے تو یہ نہیں ڈر رہا اور......'' اس سائے نے کہا جو دروازے کے پاس کھڑا تھا۔
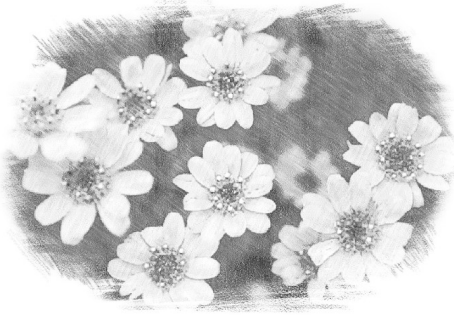
کمال الدین نے بات کاٹی: ''نو نو نو نو۔ یہ دیکھا رہا ہے کہ ڈرتا نہیں ہے......ورنہ اس خاموش زمین کے نیچے لاوا اچلا چلا کر خدا سے دعائیں مانگ رہا ہے!......جان دیتے ہوئے یہ ڈر رہا ہے''

نواز نے کمال الدین کے ہاتھوں میں موجود ڈبی سے سگریٹ نکالی اور ماچس جلا کے سلگایا۔

بہت دھیرے دھیرے اس نے کہا: ''جان! دادا جان!......جان!......جان دینا چھوٹی بات ہے ان لوگوں کے لیے جن سے آپ خود سے زیادہ پیار کرتے ہوں......اصل غم......آہا!......اصل چوٹ تو وہ ہے جو آپ کو زندگی بھر سسکا سسکا کر مارے......آپ کے پیار کو در د ملتا رہے زندگی بھر اور آپ بس خون کے گھونٹ پیئیں اور بے بس رہیں......'' اس نے دانیال کے منہ کے قریب آ کر اپنے منہ سے سگریٹ کا دھواں نکالا۔

''(سرگوشی کرتے ہوئے) گڈ بائے آنند! وعدہ رہا کہ تمہارے پیار کی زندگی جہنم بنا دوں گا! پورے پندرہ بجے اور پھر......طلاق!''

پانچواں باب

......پہلے پھول......

سناٹے میں کہیں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آجاتی ورنہ سُن خاموشی تھی۔ نہ ہوا کے چلنے کی آواز آتی نہ اس کو اپنے قدموں کی۔ نہ جانے کیوں اتنی ویران سڑکیں ہیں۔ وہ سوچتا جب جب وہ ان کو روشنوں میں خالی خالی دیکھتا۔ ایک جھرجھری سی اس پر طاری ہوجاتی۔ کئی دکانوں کے سامنے سے وہ گزرا ۔مشہور مشہور ٹیلرز کی دکانیں تھیں۔ وہ اگر چاہتا تو ایک نہیں نہ جانے سینکڑوں کوٹ خرید سکتا تھا۔ پیسے جو تھے اس کے پاس...... پورے پانسو......ٹھنڈ سے کانپتے ہوئے اس کو وہ شام یاد آگئی جب وہ آئے تھے لاہور ۔روپے نہیں تھے ان کے پاس۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ مارا......وہی سکے......

دھیان بٹانے کے لیے اس نے پان والے سے سگریٹ خریدی۔ پینے کے بعد اس کو تلاش کیا، مزید پانچ ڈبیاں خرید لیں۔ وہ ایک کے بعد ایک سگریٹ پیتا گیا یہاں تک کہ نیچے سگریٹوں کی لاشوں کا انبار لگ لگا۔ ہوش اس کا دھوئیں کے ساتھ ساتھ ہی اڑتا جا رہا تھا۔ سڑکیں جن پر باریک باریک ٹریفک چلنے لگی تھی اسے دھندلی دھندلی سی نظر آتی تھی......اس ہوش آتا اور سڑکوں پر چڑھے دھندلے جالے اتر جاتے۔

ہوا جو بہت ٹھنڈی تھی یک دم سموم زہریلی گرم ہوجاتی اور اس کے بعد جھٹ پٹ دوبارہ ٹھنڈی ہوجاتی۔

وہ سگریٹ پیتا رہا......تین ڈبیاں ختم شد......وہ سڑکوں کو دیکھتا تو اس کو احساس ہوتا جیسے وہ کسی سمندر کے بیچ و بیچ ہے یا زمین و سمندر ایک دوسرے میں گھل گئے ہیں......سڑکیں اپنی جگہ پر ہلتی ہوئی معلوم ہوتیں......

''میں نے شراب تو نہیں پی......کیا میں پاگل ،نہیں نہیں!'' وہ بڑبڑا کر بھاری بھاری کش لینے

لگا۔اس کو کوئی سایہ سا نظر آیا اپنے طرف آتے ہوئے۔دھند ہونے لگی تھی اس کو چہرہ صاف نظر نہ آیا۔

''آنند! آنند! یہ کیسے! تم تو!'' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔خوف سے اپنے آنکھوں کے کووے دبائے۔چہرہ اور صاف ہو گیا، وہی بال، وہی ناک، وہی آنکھیں...... چہرے کو سگریٹ کے دھویں نے لپیٹ میں لے لیا۔

''وجئے!'' ایک زنانہ آواز۔

''تم ......تم ......کیا کر رہی ہو یہاں؟'' اس نے گلشن کو پہچانتے ہی تیوری چڑھا لی اور دھندلاہٹ سے بھرتی سڑک کو دیکھتے ہوئے سگریٹ پیتا رہا۔

''نہ مجھے تمہاری پرواہ ہے نہ تمہیں میری ہونی چاہیے''

''مجھے تمہاری کوئی پروا نہیں'' ڈھٹائی سے جواب ملا۔

''تم نے خبر کی تھی نواز کو...... ہے نا! تم ہی تھے، دیکھو تمہاری وجہ سے وہ کس حالت میں ہے''

وہ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولا؛''وہ کیسی ہے؟''

''تڑپ، تڑپ رہی ہے......سونے کی ڈلی کو تم جاہل لوگ کس طرح کوئلے کی کھدان میں پگھلا رہے ہو'' وجئے خاموش رہا۔گلشن نے سگریٹ اس کے منہ کھینچ کر باہر پھینک دی۔کوئی ردعمل نہیں۔ایک ساکت بت کی طرح کھڑا ہے۔

''دیکھنا وجئے،قسمت کے راستے میں ڈگمگا کرنا کامی کی دلدل میں پھنسو گے، زمانے کی غلاظت میں لتھڑے تم آوارہ، مارے مارے پھرو گے!''

وہ کہنے لگا؛''گفت گو کرنے کا سلیقہ نہیں آتا تم کو، شریفوں میں دستور ہے کہ اونچی آواز میں بات نہیں کی جاتی''

''شریفوں میں یہ بھی دستور ہے کہ دوستوں کو دغا نہیں دی جاتی''

''میں نے اس کو دغا نہیں دی''

''پھر کیوں کیا اس کے ساتھ ویسا سلوک، کیوں؟'' وہ مڑ کر گلشن کو دیکھنے لگا مسکراتے ہوئے۔ مسکراہٹ سے لگا جیسے وہ کوئی بڑی بازی جیتا ہے۔پانسو کی بازی۔کیا یہ پانسو اس کے نزدیک دوستی سے زیادہ اہم ہیں۔

''اجالا کی وجہ سے......وہ لڑکی نہیں ہے'' وہ نیا سگریٹ سلگا کر دھواں اڑانے لگا۔

پوچھا؛''پھر کیا ہے......''

''وہ Dynamite ہے!اور میرا دل میرا دماغ میرا غرور وہ محل ہے جس کے اس نے

ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں...... سمجھتی تو ہو گی میری بات کو......'' وہ اس سے کے بہت قریب ہو گیا۔گلشن اس سے آنے والی گند کو سونگھ سکتی تھی۔

وہ اور قریب آیا، گلشن پیچھے نہ ہٹی، نظریں چرالیں اور وہیں کھڑے کھڑے منہ دوسری طرف کر لیا: ''آخر تم نے بھی کسی سے پیار کیا ہے، کیوں گلشن، کیا ہے نا پیار، کی ہے نا محبت! کھائی ہے نا چوٹ!'' گلشن ہاں میں سر ہلاتے ہوئے اس کو مسکراتے ہوئے دیکھتی رہی۔

''تم بے بس ہو جیسے، بس ویسے ہی، میں بے بس ہوں'' وہ پیچھے ہٹا اور دوبارہ سگریٹ اپنے ہونٹوں سے لگالی۔

''پیار کرنا تو کوئی تم سے سیکھے......'' کافی دیر بعد وہ طنزیا انداز میں بولی۔

''yeah,yeah,yeah'' وہ ہنس پڑا۔

''آنند کی مدد میں نہیں کر سکتا کیونکہ اگر باہر نکلا تو پہلے پہل مجھے جان سے مارے گا، ہاں! اگر اجالا کا کوئی بھلا ہو سکتا ہے تو کہو''

وہ اسکے قریب ہوئی: ''طوفان میں ڈبکی لگانے کو تیار ہو؟''

''کیسا طوفان کیسی ڈبکی؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔سگریٹ انگلیوں سے نکل کر نیچے گر گئی۔

وہ ہنس پڑی، کہنے لگی: ''رہنے دو تمہاری بس کی بات نہیں......لیکن کہنے کو کہہ دیتی ہوں، رقیب کو قتل کر سکتے ہو؟''

''ہاہاہا! ڈپلومیٹ! ڈپلومیٹ! ڈپلومیٹ!......انہوں!'' وہ ناں میں سر ہلانے لگا۔

''کسی کی زندگی بن جائے گی''

''کسی کی بگڑ بھی جائے گی، اگر بگڑنے کو بچی تو......''

وہ جل کر بولی: ''تم عاشق لوگ ایک رقیب کو کیسے برداشت کر لیتے ہو؟''

''تم بھی تو عاشق لوگوں میں سے ہو! اپنی رقیبہ کو برداشت کر رہی ہو!...... پتہ ہے مجھے سب پتہ ہے''

''کیا سب پتہ ہے!؟'' اس نے قدرے غصے سے پوچھا۔

''چار لفظ......''

''کیا چار لفظ؟''

اس کی نظر آسمان کو اٹھی پھر نیچے اجالا کی طرف، مسکرا کر بولا: ''نواز میرا دوست ہے''

گلشن کی ابرویں اٹھ گئیں: ''اوہو!......لیکن تم یہ دیکھ نہیں پائے کہ تمہارے جیسا دوغلا انسان ہے وہ، دغا

کرے گا تمہارے ساتھ“

وہ جلدی سے کہنے لگا؛”نا! میں پہلے دغا کروں گا! میرا پہلا وار ہوگا......اور وہ وار پہلا اور آخری وار ہوگا، جیت میری ہوگی، اجالا میں ہوگی“ وجے نے نرمی سے گلشن کے بالوں کو چھو کر کہا۔ سڑک کی دوسری طرف چند لوگ ترتیب وار گزرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

”کچھ نہیں ملے گا تمہیں اتنا دوڑ کر، جیت تم سے ڈر کے بھاگتی ہے اور اجالا تم سے نفرت کرتی ہے حالاں کہ اس نے تمہیں ایک بار بھی نہیں دیکھا اور تمہارا سوچ کر ہی اس کا دل بھڑک اٹھتا ہے“

وہ پہلے نرمی سے بال چھو رہا تھا یک دم اس نے سختی سے پکڑ لیے اور سرگوشی کی؛”دُرجن! دُرجن، بدلگام، کھوٹی بات کرتی ہو! دِرشہوار کو اگر خود نہ پا سکو تو کسی دوسرے کو بھی نہ پانے دو......وہ اجالا! اگر میری آنکھوں کو نصیب نہیں، تو سب لوگوں کو اندھیرے میں بھٹکنے دو!“

”تا کہ سب لوگ تمہاری طرح ٹھوکریں کھاتے ہوئے دراڑوں میں جا گریں؟“ گلشن نے خود کو اس سے دور کر لیا۔

وہ مثبت میں سر ہلاتے ہوئے قہقہے مارنے لگا، چلایا؛”ہاں تا کہ سب لوگ میری طرح ٹھوکریں کھاتے ہوئے دراڑوں میں جا گریں......ان دراڑوں میں جا گریں جہاں انہیں تم جیسی موم بتیاں بھی نہ ملیں، ہا آہ!“

معلوم نہیں کیوں گلشن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور تیوری چڑھائے سرخ چہرہ لیے وہ تیزی سے چلی گئی۔

☆☆☆

جب بڑی ماں اور اس نے ایسی بات سنی تو پہلے ہاتھ ہونٹوں کو اٹھ گئے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی وہ ہاتھ بالکل تالیاں بجانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لڑکی کے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ کہاں دربدر ہوتی رہے گی۔ اور اوپر سے خوبصورت بھی بلا کی ہے۔ سب سوچنے کے بعد یہ نیکی کرنے کے فیصلہ انہوں نے بھی خوشی خوشی مان لیا اور وہ خاور میاں کی موت کا غم نمرہ آپا کو اپنے بیٹے کی خوبصورت بہو دیکھتے ہی بھول گیا۔ وہ تو ہولے ہولے بڑبڑایا کرتیں کہ دونوں ہم عمر ہیں، خوش شکل بھی ہیں، جوڑی خوب جمے گی۔

اور بڑی ماں کو جو خاور کی موت کا صدما پہنچا تھا وہ اس کے زخم ان باتوں سے نہ بھرے پر دوسروں کی مسکراہٹوں کا رنگ ان پر بھی چڑھ گیا۔ گلشن نے بڑی ماں کو منایا اور نمرہ کو بھی کہ اجالا کو نکاح ہونے ان کے گھر میں نہیں رہنا چاہیے۔ بڑی ماں مان گئیں اور وہ اجالا کو اپنے گھر لے آئی۔ گلشن کے ماموں بس سارا دن کام پہ ہوتے۔ رات کے کسی پہر واپس آتے، کھانا گرم کرتے، کھاتے اور سو جاتے، صبح ناشتہ سب مل کر کرتے اور دوبارہ وہی سلسلہ شروع ہو جاتا جو گذشتہ پانچ چھ برسوں سے چلتا آ رہا تھا بنا کسی تبدیلی کے۔

وہ اپنے لوفر لفنگے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیل کر لوٹا تو حسبِ عادت گلشن کو چائے بنانے کا کہہ کر وہیں پلنگ

پر ڈھیر ہو گیا۔ اجالا کو جیسے ہی اس نے دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گلشن نے اسے سمجھایا۔ بظاہر تو وہ ناسمجھ لڑکا سمجھ گیا لیکن اجالا کو دیکھتے ہوئے اس نے یہ ضرور جان لیا کہ یہ کسی بڑے رنج میں گھل رہی ہے۔

ناصاف ناشفاف، کچیلی میلی سی سفید کرکٹ یونیفارم پہن رکھی تھی اس لڑکے نے۔ گلشن نے اس کا تعارف ہی نہ کروایا۔ اجالا کو برا لگا تو اس نے بیچارے سے خود ہی پوچھ لیا۔

''عقیل اور آپ کا؟''

''اجالا'' اجالا نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''یعنی روشنی؟ اردو کی کتاب میں تو یہی مطلب تھا'' اجالا ہنس پڑی۔

''کون سی کلاس ہے تمہاری عقیل؟''

''آٹھویں فیل ہیں حضرت! اب دوسری بار اپنا سر پھوڑنے جا رہا ہیں...... کیوں عقیل؟'' گلشن اندر آتے ہوئے بول پڑی اور اجالا کے ساتھ پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔ عقیل جو کوئی الجھا ہوا جواب دینے والا تھا آس پاس چوروں کی سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ گلشن ہنستی رہی۔ کھی کھی کھی۔

''میری چائے؟'' جب کوئی جواب نہ سوجھا تو پوچھنے لگا۔

''پتی ختم''

''میں لے آتا ہوں، آپا بھی تو پیئیں گی'' اس نے اجالا کی طرف انگلی کر کے کہا۔ اجالا نے کچھ بولنا چاہا مگر گلشن نے کہہ ڈالا: ''ختم تو چینی بھی ہے''

''اچھا'' عقیل منہ بسورے اٹھ کر چلا گیا۔

''خواہ مخواہ میں چکر لگ جائے گا بیچارے کا، کتنی دور ہے بازار''

''خواہ مخواہ کا کیوں؟ چائے کیا نہیں پیئیں گے'' گلشن نے ہنس کر کہا۔ باہر سے کار کے ہارن کی آواز کانوں میں پڑی۔ گلشن کا چہرہ اتر گیا۔ دونوں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔ ایک سپاٹ سی گاڑی۔ گلشن پوچھنے لگی: ''نواز کی گاڑی تو......''

''نہیں نہیں! نواز کی نہیں، ہاں دیکھنے میں ایک جیسی ہیں پر گاڑیوں کا رنگ بھی مختلف ہے اور گاڑی چلانے والے بھی'' اجالا واپس پلنگ پر بیٹھ گئی۔ گلشن نے اس گاڑی کو رفتار پکڑتے ہوئے دیکھا اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

کافی دیر اجالا کو آئینے میں دیکھنے کے بعد وہ بولی: ''کیا تمہیں لگتا ہے کہ یہ دعائیں جو پڑھتی ہو اسے بچا لیں گی؟''

''دعاؤں سے کیا نہیں ہو سکتا گلشن؟''

''اور بددعائیں، بددعاوں سے کیا کچھ نہیں ہوسکتا؟'' اسے نواز کا خیال آیا تو پوچھا۔

''نہیں وہ بھی اثر رکھتی ہیں، لیکن قبول کرنے والا تو ایک ہی ہے اور دعائیں اور بددعائیں دینے والوں سے زیادہ جانتا ہے...... یہ دعائیں ہی تو بدنصیبی کو دباتی ہیں، یہی تو خوش نصیبی کی دایہ گری کرتی ہیں، اور ان ساری دعاؤں کو قبول کرنے والے میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ہزار محبت کرنے والوں کو بھی ایک جھٹکے میں ملا دے''

''نہ ملایا تو کیا محبت کم ہوگی تمہاری''

''صرف ملنا ہی تو محبت نہیں...... زمین...... زمین کی طرح......''

''زمین کی طرح؟......''

''زمین کی طرح میرا عشق بھی، خلا میں گھومتا وہ دائمی دائرہ ہے جس کا محور صرف اور صرف آنند ہے، ہم دونوں میں فاصلہ چاہے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، مجھ تک اس کی روشنی پہنچتی ہے، اور اگر...... اور اگر اسے کچھ ہوا تو میں نہ جی پاؤں گی...... میں نہ جی پاؤں گی گلشن''

''صبر کرو! دعا کرو! سب ٹھیک ہوگا'' گلشن پاس بیٹھ کر اپنی تر آنکھوں سے اجالا کی آنسوں سے بھری آنکھیں دیکھنے لگی جیسے ان میں ڈوبتی جا رہی ہو۔ گلشن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور تھپتھپانے لگی۔

''آپا! پتی چینی کے لیے روپے تو آپ نے دیئے ہی نہیں'' اچانک آواز آئی۔ دونوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ عقیل دروازے سے جھانک رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

''گدھے! تم ہماری باتیں سنتے رہے! ٹھہرو میں بتاتی ہوں تمہیں'' گلشن نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اسے اشارے سے بلایا۔ وہ پاس آ کر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں گلشن کے دوپٹے سے صاف کرنے لگ گیا۔

''گلشن ایک کام ہے کرو گی میرا؟'' اجالا نے کہا۔

''بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، تم کام بتاؤ''

''آج تم جانا وہاں بڑی ماں سے ملنے کے بہانے سے......''

''ہوں! اچھا!'' گلشن نے سر ہلایا اور عقیل اپنے ہاتھوں سے اپنی ناک صاف کرنے لگا۔

''اور جب نواز پاس ہو تو بڑی ماں یا نمرہ آپا سے یہ بات کرنا کہ آنند قید سے نکلنے والا ہے''

''وہ قید سے نکلنے والا ہے؟'' گلشن حیران ہوئی۔

''نہیں نہیں...... کاش...... یہ بات کرنا تم ٹھیک ہے۔ نواز کے کانوں میں بات پڑے گی تو وہ

اس کو دوسری جیل بھیجیں گے...... بڑی جیل......'' گلشن سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیوں ایسا کرنا چاہیے۔

''میرا دل کہتا ہے کسی نہ کسی طرح وہ راستے میں ہی خود کو چھڑا لے گا! دل کہتا ہے میرا''

☆☆☆

باہر پولیس والوں کا طنطنہ بلند تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی میلا لگا ہوا ہے۔ پیاس سے گلا کانٹا بن رہا تھا۔ دس منٹ پہلے ہی وہ طنازی اداؤں والا پولیس گارڈ اسے پانی کے چند گھونٹ دے کر گیا تھا۔ لیکن ان سے پیاس نہ بجھنی تھی نا بجھی۔ جسے پانی کا نام دیا گیا تھا پینے میں بھی وہ معائع پانی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ زبان سے ملتے ہی اس کو یہ پختہ احساس ہوا کہ اس میں کچھ نہ کچھ ملا کر دیا گیا ہے۔ وہ کھانے پر بھی کچھ چھڑک کر دیتے تھے۔ کھانا تھا ہی کیا، بس روٹی کے چند ٹکڑے اور گول گول سی کوئی چیزیں جنہیں کھا کر اس کو فوراً الٹی آ جاتی تھی۔ وہ تو اس دوسرے دن ہی کھانے بند کر دیئے تھے۔ ڈبا نما بیت الخلا کونے میں موجود رہتا۔

باہر ہنسنے والے دو لوگوں کی باتیں اس کے کانوں میں ایک بار پڑیں کہ گدھوں اور بکروں کی آنکھیں اسے کھانے کو دی جاتی ہیں۔ انہیں وہ اس اوپر والی اس چھوٹی سی کھڑکی سے باہر پھینکنے کی کوشش کرتا جس کا حجم تین کتابوں سے بڑا نہ ہوگا۔ کھڑکی کی سلاخوں پر جالے جم چکے تھے۔ کھڑکی بہت اوپر تھی اس کی پہنچ سے بہت دور۔ روٹی کے میلے کڑوے ٹکڑے نگلنے کے بعد وہ ان گول گول چپچپی سی چیزوں کو ان سلاخوں کے باہر بھیجنے کی کوشش کرتا۔ زیادہ تر وہ دیواروں سے ٹکرا کر واپس نیچے آ جاتے۔

رات کو چند لوگ جب اسے پیٹ پیٹ کے جاتے تو درد سے فرش پر پڑے پڑے کانپتے ہوئے اسے باہر سے قہقہوں اور دور بھونکنے والے کتوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ پسلیوں، دل اور آنتوں میں ایسا محسوس ہوتا جیسے گس کے گرہیں باندھ دی گئی ہوں۔ تمام رات اسے نیند نہ آتے اور دن میں جاگتے ہوئے اس کا دماغ سنہرے خیالوں کا طواف کرتا۔

ایسے خیال آتے رہتے اور پھر اس کو ایک دم سے ہوش آ جاتا اور کچھ سوچ کر اس کا دل گھبرانے لگتا۔ پر وہ منہ ایک آواز نہ نکالتا اور لوہے کے اس بند دروازے کو دیکھ کر نظریں جھا لیتا۔ دسمبر تھا اور شام تک کمزور سی دھوپ رہتی تھی جس میں وہ سردی کو برداشت کر لیتا۔ لیکن جب شام ہوتی تو سردی بھی طول پکڑتی جس سے اس کے ننگے سینے کو ڈھانپنے والی پتلی چادر نا کارہ سی لگتی۔

اس کی حالت طور بے طور ہو رہی تھی لیکن داروغہ کی اسے بیڑیاں نہ لگانے کا حکم اسے جہنم کے مزید گہرے درجے سے بچا رہا تھا۔ دن بھر اجالا کے خیال آتے رہتے......اور پھر......

''ماں کی بد دعا لوگے......مرنے کے لیے کوئی چوکھٹ بھی نصیب نہیں ہوگی!'' ماں کا یہ جملہ اس کے خیالوں پر طوفانی تھپڑ کی طرح پڑتا۔ وجئے کے خیال کم آتے۔ روہت کی موت کے آتے اور دل رونے

لگتا اور یہ خیال بھی آتا کہ کاش وہ روہت سے یہ تو پوچھ لیتا کہ ڈاکٹر راجندر مرنے سے پہلے اسے کیا بات بتانا چاہتے تھے......

لیکن اب جاننے کا کوئی راستہ نہیں تھا...... یا کم از کم نظر نہیں آ رہا تھا......

☆☆☆

بڑی ماں کے سامنے بیٹھے وہ سگار پی رہے تھے۔ کیسی شان سے بیٹھے تھے جیسے کوئی بادشاہ اپنے تخت پہ بیٹھتا ہے، لیکن وہ کرسی پر بیٹھے ہیں اور ان انگاروں کی طرح سرخ آنکھیں بہت ہی ڈراونی لگ رہی ہیں جنہیں دیکھنے پر بھوت پریت کا خیال ایک دم دماغ میں آ جاتا ہے۔

وہ جب کھانستے ہیں تو کھانسی میں بلغم کا شرارہ پھوٹتا ہے، دوا انہوں نے کچھ دیر پہلے ہی لی ہے، اور اب بڑی ماں یعنی اپنی بہن سے باتیں کرتے ہوئے سگار پی رہے ہیں۔ اس سگار پر، جو وہ پی رہے ہیں، جس پر سرخ رنگ کی دھاریاں سی بنی ہوئی ہیں جیسی کوئی ندیاں ہوں جو سخت بنجر زمینوں کو کاٹتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی ہوں۔ ''Davidoff Cigars 707 Royal Series'' ان سرخ ندی جیسی لکیروں والے سیاہ سگار پر گولڈن حرف میں یہ چھوٹا چھوٹا سا لکھا ہے۔ وہ سیاہ لباس پہنے ہیں اور ان کے وہ بال، مونچھیں جو پہلے سفید تھیں اب رنگنے کی وجہ سے سیاہ ہو چکی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ کوئی پچاس برس کے مرد ہو رہے ہیں۔

نواز تھوڑی دیر پہلے ہی پاس بیٹھ بیٹھ کر گیا تھا۔ پلنگ پر اس کے بیٹھنے کے نقوش ابھی تک ثبت تھے۔ ڈھیلی ڈھالی سبز چادر پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔

''تو ہاجرہ آپا آپ بھی اس رشتے سے خوش ہیں'' سگار ایشٹرے میں رکھتے ہوئے بولے۔

''ہاں میں تو ہوں لیکن ایک بار لڑکی سے بھی......''

انہوں نے بات کاٹی: ''ارے لڑکی کا کیا؟...... وہ کیوں انکار کرے گی، غریب خاندان کی لڑکی ہے، پیچھے کوئی نہیں بچا اس کا، کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرے گی''

''یہ بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی، کافی پیاری بچی ہے''

''ہوں!'' انہوں نے یہ کہہ کر دوبارہ سگار اٹھا لیا اور پینے لگے۔

''اس کا کیا ہوا؟ (آنند)''

''ہونا کیا ہے میں مارنے والا تھا سالے کو، یہ نواز بیچ میں آ گیا، کہنے لگا کہ جان سے نہ ماریں، اس نے بہت بڑا جرم کیا ہے اس طرح آسانی سے رہائی نہ دیں اس کو، اس کو آپ سسکا سسکا کر ماریں، ایک ہی بار پہ مارنے سے اچھا ہے...... ھے ھے ھے ھے!''

بڑی ماں ہنسنے لگیں؛ ''کھی کھی!......''

''میجر صاحب آئے ہیں آپ نے بلایا تھا جنہیں'' نواز نے اندر جھانک کر کہا۔ وہ اس کے ساتھ اٹھ کر چلے گئے۔ باہر پولیس کی تھوڑی بہت نفری موجود تھی۔ جب وہ لوٹا تو بڑی ماں کے ساتھ گلشن بیٹھی تھی۔ وہ تھوڑا سا ٹھٹھکا اور دراز سے کمال الدین کی ٹیبلٹس ڈھونڈنے لگا۔

گلشن دھیرے سے بولی: ''بڑی ماں، معلوم ہے وہ آنند بھاگنے والا ہے، جیل کے کچھ لوگ ہی مدد کریں گے اس کی'' نواز کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ دراز کھنگالتا رہا۔

''اے ہے! یہ کیسے؟ تمہیں کس نے بتایا''

''بس بڑی ماں مجھ سے نہ پوچھیئے کہ کیسے پتہ ہے مجھے، جس جیل میں وہ ہے وہ تو چھوٹی سی ہے بہت''

''لیکن تمہیں بتایا......''

نواز نے مسکرا کر بڑی ماں کی بات کاٹی؛ ''نہیں نکلے گا نہیں نکلے گا گلشن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں'' اس نے دوا ڈھونڈ لی۔ جاتے ہوئے وہ دروازے کے پاس رک گیا اور مڑ کر گلشن کو دیکھا۔

کہنے لگا؛ ''ویسے بڑی جیل میں گلنے سڑنے کے لیے بھیجنے میں بھی کوئی برائی نہیں! یاد رکھو گلشن! آزادی کا آنند (سکون)، اس کمینے آنند کی قسمت میں نہیں!'' وہ یہ کہہ کر جلدی سے چلا گیا۔

☆☆☆

کونے میں اپنی رضائی میں دبکا بیٹھا وہ اپنا سکول کا سبق یاد کر رہا تھا۔ موم بتی جل رہی تھی جو کھڑکی سے آنے والی ہوا کی لہروں سے لڑکھڑاتی اور سنبھل جاتی۔ ماموں جان تھوڑی دیر ہوئی آئے تھے اور عقیل پر اپنا رعب داب جھاڑ کر چلے گئے۔ اجالا کو وہ قطعی اچھے نہ لگے۔

ایسے ہی خواہ مخواہ میں اکبر بادشاہ بننے کی کوششیں کر رہے تھے۔ جیسے وہ ٹھاٹ سے تخت پر بیٹھتے تھے اسی طرح ماموں جان نیچے دری پر شان و شوکت سے اٹھتے بیٹھتے رہے۔ اوپر سے ان کی صحت......توبہ! سر پر سفید رنگ کی نمازی ٹوپی، کینگرو کی طرح آگے کو جھکے ہوئے کندھے، اور چھوٹا سا قد۔ بالکل مرغی کا چوزا لگتے تھے۔

اجالا سے تو انہوں نے کئی بار صرف اس کا نام پوچھا کیونکہ انہیں بھولنے کی عادت تھی۔ اجالا کا انہوں نے پورا انٹرویو کیا۔ اس کے بعد اپنے کاروبار کے مرثیے پڑھنے شروع کر دیئے۔ اجالا کو سننا پڑا کہ کیسے پورے شہر میں ان کی دکان کے کدوؤں اور بھنڈیوں کی مانگ دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔

پھر وہ سیاست پر چھڑ گئے اور ایسے چھڑے کہ اجالا سے **Communism** پر بحث کروا کے چھوڑی۔ اعلیٰ درجے کے اڑیل انسان تھے۔ آخر تک اڑے رہے یہ کبھی نہ مانا کہ کمیونزم چارلس ڈارون

نے ایجاد نہیں کی۔

اجالا کو تھکا ہرا کر آخر وہ چلے ہی گئے لیکن عقیل کو یہ دھمکی دے کر گئے کہ اگر نو بجے سے پہلے تک اگر سبق نہ یاد کر لیا تو، تو، تو کیا ہوگا یہ بتانا انہوں نے گنوارا ہی نہ سمجھا۔

''آپا......'' عقیل بولا اور اجالا چونک پڑی۔ اس کا دھیان حال میں لوٹ آیا۔

''جی میری جان، بولو، کیا بات ہے؟'' وہ پیار سے بولی۔
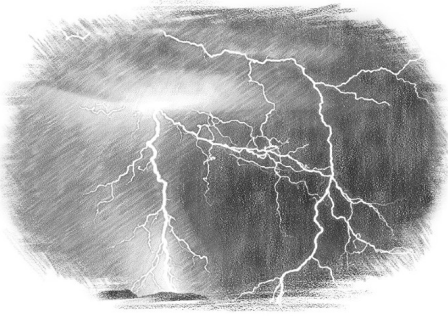
''آنند...... میرا مطلب ہے دانیال بھائی، وہ مریں گے تو نہیں نا؟''

کچھ دیر ہوا کھڑکیوں سے آتی رہی اور کچھ دیر موم بتی کا شعلہ پھڑ پھڑاتا رہا۔

''نہیں، بچ جائیں گے......'' اس کی آواز میں روہانسا پن شامل ہو گیا۔

تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور جیسے موم بتی کے شعلے پر رعشہ سا طاری ہو گیا ہو۔ روشنی لڑکھڑاتی رہی اور پھر اگلے ہی لمحے اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

چھٹا باب

......کیسی بہاریں؟......

وہ اندر آئے اور گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے گئے۔ گاڑی میں دھکے دے کر ڈالا اور گاڑی چل دی۔ آنکھوں پر پٹی کس کر بندھی تھی۔ گاڑی اوبڑ کھابڑ راستوں سے گزر رہی ہوگی، بہت جھٹکے لگ رہے تھے ۔پھر اچانک کچھ چیزیں ٹکرانے کی آواز آئیں جیسے گدی پہ کوئی ڈنڈے مار رہا ہو اور جیسے دو انسان آپس میں لڑ رہے ہوں۔ کسی نے آنکھوں پر بندھی پٹی پھاڑ ڈالی۔ تیز روشنی، آنکھیں چندھیا گئیں۔ دیکھا تو ایک پولیس والا گھبرایا کھڑا ہانپ رہا تھا۔

جلدی سے بولا؛ ''آپ جلدی بھاگو جلدی پیچھے سے اور گاڑیاں بھی آ رہی ہیں'' دو پولیس والے پیچھے بے ہوش پڑے تھے۔

''لیکن آپ ہیں کون؟'' اس نے پوچھا۔

''میں اس بچی کا باپ ہوں، جسے گولی لگی تھی، وہ زندہ ہے، سلامت ہے، اب آپ جلدی کریں وہ آنے والے ہوں گے!'' وہ پستول اٹھا کر جلدی سے باہر نکلا۔ پاس ہی بہت سے پیپل کے پیڑ تھے، وہ ان کی طرف بھاگ پڑا۔ پیچھے سے مدھم مدھم گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ کچھ چیخ و پکار پھر ایک تڑا کے دار گولی کی آواز گونجی۔ وہ دوڑتا رہا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پولیس پیچھے آ رہی ہے، شور شرابا!

کمزور جسم کو کھینچنا مشکل لگ رہا تھا لیکن وہ پورا زور لگائے دوڑتا رہا۔

☆☆☆

اس گول گھڑی سے منعکس ہونے والی روشنی جہاں پڑتی ہے وہاں دو بند الماریاں ہیں۔ان الماریوں کے نیچے ہی وہ گدلا اور ملول سا صندوقچہ ہے جس پر بہت ہی منفرد انداز کی دلکش عربی تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔اور یہ تحریریں ہاتھوں سے خطاطی کی گئی تھیں۔یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اپنی زندگی کے دو تین سو گھنٹے اس چھوٹے صندوقچے کو بنانے میں صرف کیے تھے۔یہ صندوقچہ ایسا ہے جو نفرت کے احساسات کو منعدم کر کے ان کے جگہ محبت اور پزیرائی کے بیج بو دیتا ہے۔کتنا کمال لگتا ہے۔

تحریر مختلف رنگوں سے لکھی گئی ہیں۔نیلا، ہرا، سفید، اور مالٹائی۔اب تو یہ صندوقچہ جالوں کی زینت بن چکا ہے۔پر بڑی ماں کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب یہ شاخ در شاخ تتر بتر نہ ہوا تھا اور عیاں کرنا بہت مشکل کام تھا تب اس میں بہت خوفیا چیزیں چھپائی جاتی تھیں۔یہ چھوٹا صندوقچہ بلا کا مضبوط تھا۔اس کو چت کرنے کے منصوبے جو وہ بچپن میں بنا کرتی تھی سب غارت جاتے تھے۔مجال تھی جو کبھی اس پر آنچ بھی پڑ جاتی، اینٹوں کے وار، اٹھا نا پٹخنا، دیواروں پہ مارنا، پتھروں میں کچلنا......سب بیکار جاتا۔تب یہ صرف ضروری کاغذ محفوظ کرنے کا ذمہ دار تھا مگر آج اس کی حالت بھی بدل گئی ہے اور ذمہ داری بھی۔آج اس کا کام صرف بڑی ماں کے طلاق کے کاغذات اور ان کے پرانے خطوط کو سنبھالنا تھا جو ان کے شوہر نے لکھے تھے جو ان کے محبوب نے لکھی تھے اور یہ سارے خط شادی سے پہلے کے تھے۔

بچھڑنے سے پہلے دونوں جتنا عرصہ ساتھ رہے خوش رہے۔پھر ان کے شوہر کو کوئی دوسری عورت پسند آ گئی اور ایک رات غصے میں انہوں نے اپنی بیوی کو اپنی بیوی نہ رہنے دیا اور سب ذمہ داریوں سے آزاد ہو گئے۔جب کمال الدین کو خبر ہوئی تو انہوں نے سابقہ شوہر کو دنیا کے جھنجھٹ سے ہی آزاد کر دیا!

"کا ہے اس میں بڑی مالکن؟" ککو کی ماں نے کندھے دابتے ہوئے پوچھا۔

بڑی ماں چونکیں پھر بپھر کر بولیں: "تمہیں کیا، سہی سے کندھے دابو!"

"نائیں! نائیں! کوئی بات جرور ہے" ان کالے ننھے ہاتھوں نے کندھے دابنے تیز کر دیئے۔بڑی ماں کچھ نہ بولیں۔ایک دم چپ۔

"میں بتاؤں کا ہے!" اچانک وہ آگے جھک آئی۔

"آئے ہائے، پیچھے مر! اچھا بتا کیا ہے اس میں" بڑی ماں اس کو پیچھے دھکیل کر بولیں۔

''آپ کے میاں کی کوئی یادیں ہوں گیں......ہی ہی، خی غی......غی خی!''

''چپ! ایک دم چپ! اب کچھ نہیں بولو گی تم'' بڑی ماں اسے ڈانٹ کر اپنے خیالوں میں کھو گئیں جب وہ محبت کیا کرتیں تھیں، جب ان کو بھی محبت ہوئی تھی۔

انہوں نے خاصے فالتو انداز میں پوچھا؛''وہ تمہارا میاں، کیا نام تھا اس کا؟ کچھ یاد نہیں!''

''ککو کے ابا!'' وہ پیچھے سے چلائی۔

''یہی نام ہے!؟''

''نہیں......'' اس نے معصومیت سے جواب دیا اور کندھے دابنے بند کر دیئے۔

''جہاں تک اپنے کو یاد پڑتا ہے، دھنوا نام ہے اس کا'' وہ بول کر کمر بازو دابنے لگی۔

''آج کل کیا کرتا ہے؟'' سوال ہوا۔

''وہی سگریٹوں بیڑیوں والا بیوپار، پر مالکن مجھے ایک پھوٹی کوڑی نہیں دیتا''

''گھر تو آتا ہے نا''

''نائیں!'' اس نے زور زور سے سر ہلایا۔ کافی دیر خاموشی رہی۔

پھر وہ خود ہی ہونٹ لٹکا کر کہنے لگی؛''گھر کاہے کو آئے گا کیسی میم صاحب کے چکر میں جو پھنس گیا ہے دھنوا'' بڑی ماں نے مڑ کر اس کالی کلوٹی بھدی عورت کو دیکھا اور تخیل میں اس کا موازنہ اس میم صاحب سے کرنے لگیں۔

''وظیفہ بھانتی ہوں دیکھنا ایک دن جرور اپنے دن پھریں گے''

☆☆☆

اس کے سامنے وہ سگار پینے والے صاحب بیٹھے تھے جن سے اس کی پہلی ملاقات وہی تھی۔ نواز دروازے سے لگا کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ سامنے میز پر پڑے چند کاغذ ہوا کی مدد سے اس بھاری بھر کم کتاب کے نیچے سے نکلنا چاہتے تھے۔ اس نے چائے کی ایک چسکی بھری۔

کمال الدین آگے جھکے اور بولے؛''ٹھیک ہے بھئی، اگر اسی میں تمہاری خوشی ہے وجئے تو میں انکار نہیں کرتا، مگر تم اس کو اپنے دھرم کا بناؤ گے یا تم......''

''اس کو اپنے دھرم کا بنائے گا، Come On'' نواز نے آگے بڑھ کر وکالت کی۔

''ٹھیک ہے پھر فیصلہ ہو چکا ہے تمہارے نکاح کے دن، ان کے بھی ساتھ پھیرے ہوں گے ......گلشن کے ساتھ......اوہو! مادھوری کے ساتھ! ھے ھے ھے!'' وہ سارے قہقہے مارنے لگے۔کافی دیر بعد وہ نکل آئے باہر۔ وجے سگریٹ پیتا رہا اور نواز ٹیلیفون پر بات چیت کرتا رہا۔ باتوں کے دوران وہ وقفے وقفے سے اپنے چہرے ہاتھ پھیر کرتا جیسے پریشان ہو رہا ہو۔اس کو ہر صورت ڈھونڈو!۔صرف یہ چار پانچ دفعہ چلا چلا کر کہا۔ وجے نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔

''ارے یار وہ کمبخت! بھاگ گیا چھوٹ کے'' سگریٹ وجے کی انگلی جلاتے ہوئے نیچے گر گئی۔

''آنند! ضرور کسی نے مدد کی ہوگی ورنہ......''

''جس نے مدد کی تھی اس کو قتل کروا دیا میں نے سالہ! غدار!'' آواز میں بڑی گرج تھی اور دائیاں ہاتھ مضبوطی سے ٹیلیفون کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ جیسے کوئی اژدہا اپنے شکار ہرن کے گرن لپٹتا ہوا اور اپنی پکڑ مضبوط سے مضبوط کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ہرن بیچارے کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز آنے لگتیں ہیں۔ وہ نئی سگریٹ سلگانے لگا۔

☆☆☆

کتنے دن ہوئے وہ ٹھیک سے نہ کھا پا رہی تھی پر جیسے ہی اس کے کانوں میں ایسی خبر پڑی تو رہی سہی بھوک اور نیند بھی ہاتھوں میں سے پانی کی طرح بہہ گئی اور پیچھے کوئی نام ونشان ہی نہ چھوڑا۔ ویسے تو اسے معلوم تھا کہ ماموں جان یہ رشتہ کبھی نہیں مانیں گے لیکن یہ خوف کھائے جاتا کہ کہیں کمال الدین سے ٹکر لینے کے خوف سے ماموں جان اس کی جان سے ہاتھ نہ کھڑے کر دیں اور وہ درندا اس پر ہاتھ صاف کرتا پھرے، خبر کے بعد سے ہی سے اس کو اپنی ماں کی یاد ستا ستا کر ہلکان کر رہی تھی۔ ماموں جان سے چمٹ کر وہ گھنٹوں روئی، ان کی شکل تک تک کر اپنی ماں کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتی۔ کبھی آبرو، ناک، آنکھیں، ہونٹ اور گال تبدیل ہو کر کسی جن کی شکل لے لیتے اور کبھی اس کو وہ وجے کی مورتی میں ڈھلتے ہوئے نظر آتے......

اللہ! کیسے ڈرپوک ہیں ماموں، ڈر ڈر کہ آدھا خون انڈے کی زردی کی طرح سفید ہو چکا ہے اور یہ حامی بھرنے کو تیار نہیں کہ بھانجی کو ہر صورت بچائیں گے۔ یہ خیال بھی آجاتا کہ کراچی میں جو ان کی خالہ رہتی ہیں، بڑی ہی نیک اللہ والی ہیں، کیوں نہ انہی کہ پاس بھیج دیا جائے گلشن کو اور ساتھ اجالا بھی

ہو لے گی۔ دونوں بلائیں ایک ساتھ ماموں جان کے سر سے ٹلیں گی لیکن وہ اس خیال سے تھر تھر کانپ جاتے کہ اگر کمال الدین کو کہیں سے خبر ہو گئی...... وہ تو ہو ہی جانی تھی، اور ان سے بچ کر وہ کہاں جاتے، آخر پورا ملک جیسے ان کی ہتھیلی میں ہے۔ کسی کو بچانے میں وہ خود اتنی بری طرح پھنس گئی۔ کیا ہی ہو جاتا کہ اگر وہ وجے کو منہ ہی نہ لگاتی۔ گلشن کو پورا پورا احساس تھا کہ شادی کا مقصد فقط اجالا تک کی رسائی تھی۔ وہ نواز کا دوست...... اور وہ گلشن کی سہیلی۔ آگے کہیں نہ کہیں تو وہ آستین کا سانپ ڈسے گا تینوں کے تینوں کو اور بیچ میں کمال الدین اور نمرہ کو بھی وہ اجگر بن کر نگل جائے گا۔ بس رہ جائیں گی تو بڑی ماں...... اور ان کی کھٹ کھٹ تسبی!

باہر درختوں کے پتے ایک دوسرے سے کندھے بھڑانے لگے، کسی کے دوڑنے کی آواز آئی، پھر تین کتوں کے ایک ساتھ بھونکنے کی جن کو اگلی ہی گھڑی چپ لگ گئی۔ شام کے بجھتے اندھیروں میں کہیں دور کوئی بھاگا قیدی بھی بھاگ رہا ہو گا نہ صرف اپنے لیے بلکہ ایک اور جان کے لیے۔

☆☆☆

پیاس سے گلا خشک تھا۔ راستے میں اس کو ایک گہر لیکن اخشک کنوں نظر آیا تھا۔ ٹانگیں شل ہو چکی تھیں بلکہ اب تو کانپنے لگیں تھیں جیسے ابھی وہ نیچے اس بھربھری مٹی پر گر جائے اور کم از کم تین گھنٹوں تک تو کوئی اس کی لاش کو نہیں اٹھائے۔ دل کی گھبراہٹ اور بھی زیادہ تھی۔ جسم بیچ میں آدھا کٹا ہوا محسوس ہوتا۔

اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہی ویرانی جو صحراؤں میں ہوا کرتی ہے۔ وہی ویرانی۔ تین چار ٹرک گزرے سامان سے لدے ہوئے لیکن دور سے انہیں دیکھتے ہی وہ ایک طرف بھاگ کر چھپ جاتا اس خوف سے کہ کہیں پولیس نہ ہو۔ ایک گاڑی آئی اور اس کے پاس زور سے بریک لگا دی۔ گاڑی دھیرے دھیرے جھٹکے کھاتی ہوئی پہنچ گئی لاہور۔

اس نے نگاہ اٹھا کر سرمئی آسمان کو ایک گھڑی دیکھا۔ چیلیں اور کوّے منڈلا رہے تھے جیسے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ شکار مرنے والا ہے اور پھر اس کا لذیز گوشت ان کے کھانے کے لیے تیار ہو گا۔ ایک تانگے والا لپکا۔ دانیال نے لوٹا دیا۔ دو تین ٹیکسی والے بھی اس کو دیکھ کر بڑھے مگر وہ سب کو ٹالتا گیا۔ لگ رہا تھا جیسے وہ لاہور میں اکیلا ہے۔ لوگوں کا ہجوم تھا مگر سُونا سونا لگتا تھا۔

☆☆☆

اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرانے لگا اس لیے وہ اٹھ کر ماموں جان کے پاس چلا گیا۔ وہ میز کے سامنے کرسی پر التی پالتی مارے بیٹھے آنکھیں سکیڑ کر اخبار پڑھ رہے تھے۔ سفید کپڑے۔ اخبار کی پشت پر بنے گاندھی جی کی طرح۔ وہ دروازے آڑ سے ادھر ادھر جھانکتا رہا پھر نیچے سامنے ہی سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ ابھی پوچھیں گے کیا ہوا اور پھر میں ان کو سچ سچ بتادوں گا کہ بات ہے کہہ دوں گا کہ نانا جان کی پرانی بندوق میں کارتوس ڈال کر رکھ لیں، استعمال کرنے کی ضرورت پیش تو کرلیں استعمال بھی۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ناخن چباتے ہوئے سوچنے لگا۔ ماموں جان نے ایک نظر خفگی سے دیکھا پھر اخبار میں اپنا منہ چھپا لیا۔ عقیل کو ان کی بس سفید ٹوپی ہی اس قومی اخبار کے اوپر نظر آ رہی تھی۔ وہ کھانسا۔

ماموں صاحب نظر انداز کر گئے۔

کھاوں کھاوں!......پھر نظر انداز......

ٹخوں ٹخوں، آ آ آ آ چھیں! ٹخوں ٹخوں!!......

''ابے کیا ہو گیا!'' ماموں جان اخبار کی دوسری طرف سے دھاڑے۔

عقیل ڈر کے اپنا سر کھجلانے لگا۔ پہلے کتنا آسان لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی حکمران ہو اور ماموں جان کو حکم دے گا اور وہ چپ چاپ نظریں جھکائے اس کا حکم کو پورا کر دیں گے۔

''وہ......نانا جان کی بندوق جو تھی، اس کو استعمال کرنے کی ضرورت ہوئی تو......میں نکال دوں؟'' ان کی چیتے جیسی نظروں سے بچنے کے لیے اس نے کھانسی کا دورہ اپنے سر کر لیا۔ پھر اچانک اس کو جیسے جوش کا غلبہ سوار ہو گیا۔ آنکھیں جل کر انگارہ ہو گئیں۔ بہن کی محبت خوف پر حاوی ہو گئی۔ وہ اٹھا، بھنا کہ اور ماموں جان کی اخبار جھپٹ کر شیشے کی میز پر دے ماری۔ ماموں خونی نظروں سے اسے کانپتا ہوا دیکھنے لگے۔

''ابے چوزے......'' آنکھیں مزید سکیڑ کر انہوں نے اس کے جسم کی طرف اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا۔

عقیل ان سے دور پھسلنے لگا لیکن انہوں نے اپنے سفید بغلے جیسے لمبے لمبے بازو بڑھا کر اس کو قریب کھینچا اور ایک چپت اس کے گرم گرم گدگدے گالوں پر ماری۔ عقیل کو لگا گال پھڑ پھڑا رہے ہیں۔

اس کا گلا اور آنکھیں بھر گئیں، بولا؛ ''آپ کیسے کر سکتے ہیں؟ کیوں! بچالیں انہیں''

''بچایا ان سے جاتا ہے جن سے بچا جا سکتا ہو!......ابے چوزے! آج شام نکاح ہے آج شام! باہر پولیس والے مجھے بھی کہیں نہیں جانے دیتے! تمہیں ساتھ بھگا کے لے جانے کو تو میں کوشش کروں،

کہنا آسان لگتا ہے لیکن کوئی ایسی جگہ ہی نہیں جہاں چھپا جا سکتا ہو!''

''کیا کوئی نہیں بچا سکتا'' وہ ان کے گھٹنوں پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''نہیں!'' جھک کر نرمی سے بولے۔

''کیا خدا بھی نہیں بچا سکتا؟''

''خدا بندوں کو بندوں کے ذریعے ہی بچاتا ہے!......ہم پر کوئی کرامت ہوگی مجھے نہیں لگتا'' انہوں نے دھیرے سے اخبار اٹھالی اور اپنے چہرے کے آگے کر کے آنکھوں میں آنے والے موٹے موٹے آنسو چھپانے لگے۔ وہ کافی دیر ان کے گھٹنے پر سر رکھے بیٹھا رہا اور ان کا گھٹنا گرم اور گیلا ہوتا گیا۔

''ٹھیک ہے آپ کچھ نہیں کریں گے لیکن میں ضرور کروں گا، ان وحشیوں کو مار نہ سکا خود کو ضرور مار ڈالوں گا!'' وہ گیلے گال پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک سنسنی سی ان کے جسم میں دوڑ گئی۔ اخبار فرش پر پھینک کر انہوں نے اس کو بازؤں سے پکڑا اور اس کو گھورنے لگے۔ وہ بے اختیار سسکیاں لیتے ہوئے رو رہا تھا، ماموں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا لیکن ان خوف زدہ آنکھوں سے قطرے نکل نکل کر گالوں پر تیرتے جا رہے تھے۔ اس کے بازوں کے گرد گرفت مضبوط ہوئی......پھر مزید مضبوط......اس کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی اور رخسار پر بہتی ندی کی رفتار تیز ہوگئی۔

''نمرود آگ میں پھینکے تو خدا بچا سکتا ہے! خود کو آگ میں پھینکو گے تو نمردہ کیا خدا بھی نہیں بچا سکتا!''

سسکیاں رک گئیں یک دم اور بانہوں کے گرد بندھے ہاتھ کی گرہ بھی کھل گئی۔ انہوں نے عقیل کو ایک جھٹکے کے ساتھ چھوڑا اور جھک کر فرش سے اخبار اٹھا کر چلے گئے۔ وہ نیچے کافی دیر اپنی ٹانگیں بازؤں میں پکڑے بیٹھا رہا۔

ساتواں باب

......بچھڑتی سانسیں......

چھوٹی سی شیشی جس میں نیلے رنگ کا مادہ ہلتا جلتا رہتا ہے، بلبلے مسلسل بنتے رہتے ہیں اور مرتے رہتے ہیں۔شیشی آدھی انگلی سے قدرے بڑی تھی۔سرخ ڈھکن کا رخ کبھی وہ آسمان کی طرف کرتی اور شیشی کے تہہ میں دو چار بلبلے سے بن جاتے اور جب سرخ ڈھکن کا رخ زمین کے سینے کی طرف ہوتا تب ڈھکن سے بلبلے خود کو جوڑتے اور فنا ہو جاتے۔نیلا مائع بالکل آسمان کے نیلے رنگ کی طرح لیکن ایسا تھا جس میں کسی حد تک سیاہی ملائی گئی تھی۔گاڑھے نیلے سے کچھ کم اور ہلکے نیلے سے کچھ زیادہ۔

زہر کی شیشی!......Havoc Amatoxin ...... اس نے شیشی کو اپنی آنکھوں کے قریب کر کے دیکھا۔کسی کے قدموں کی چاپ!۔نیلی شیشی کو آستین میں چھپنا پڑا۔

نمرہ اندر آئی بجھے ہوئے کلیجی کپڑوں میں۔اجالا نے ہاتھوں کی طرف دیکھا معمول کے خلاف چند چوڑیاں، چھنن چھنن، کر رہی تھیں۔

’’نکاح کہ وقت پہنو گی کیا؟‘‘ اجالا نے جواب نہ دیا اور خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو کہ کون پوچھتا ہے کہ مرنے کے لیے کیا پہنو گی۔کون سے جوڑے میں مرتے ہوئے اچھی لگو گی۔

اس نے منہ پھیرا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی اور اس کا سر جو وہ گھٹنوں میں دیئے بیٹھی مزید ایک طرف ڈھل گیا اور بالوں نے بھی سر کی نقل اتاری۔

''میں لائی ہوں، وہ پہننا تم'' ایک ماں اپنے بیٹے کی شادی کی بچے کھچے ارمان سمیٹنے کی کوشش میں کہتی ہوئی چلی گئی۔ دروازہ بند ہوا اور Havoc Amatoxcin کو وہ ایک بار پھر الٹا سیدھا کرنے میں لگ گئی۔ وہ امیدیں ڈھونڈنے لگی ان ٹوٹتے بنتے بلبلوں میں کہیں...... کہیں آنند ڈھونڈنے لگی، کہیں سکون ڈھونڈنے لگی۔ اور پھر یکا یک باہر سے گاڑیوں کی چیخ وپکار سنائی دینے لگی۔ مدھم لیکن بہت آوازیں تھیں۔ کوئی لڑکیاں، کوئی مرد، بڑی ماں اور پھر نواز اور پھر کمال الدین اور پھر ایسا لگا جیسے خاور کہیں کانوں کے اندر گھس کر سرگوشی کر رہا ہے، اس کو کاٹ دوڑنے کی کوشش کر رہا ہے اور خی غی...... غی خی والی ہنسی ہنس رہا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

تپتی شیشی کو اپنی مٹھی میں سختی سے بھینچ کر اس نے چپل پہنے اور ہولے ہولے پرانے پردوں کے ساتھ لگ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کی جو مکان کے شمال میں کھلتی تھی۔ مشرق میں گیٹ تھا۔ ایک لمحہ وہاں ٹھہر کر دیکھے بنا ہی لوٹ آئی۔ دھڑکنیں پست ہوتی گئیں۔ جب کچھ دیر ویران کمرے میں بھٹکنے سے بات نہ بنی تو وہ پھر کھڑکی کی آڑ سے آنکھ لگا کر اپنا جنازہ دیکھنے لگی۔

نظر ایک چہرے سے اچھل کر دوسرے پر جا بیٹھتی۔ پولیس والے بھی دور کھڑے بغل میں بندوقیں دبائے چند سائیکل سواروں کو روک کر کچھ کہتے ہوئے ہاتھوں سے اشارے کر رہے تھے۔

گلشن کمرے میں آئی اور اس کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔

''ہم کراچی جا رہے ہیں، اپنا سامان باندھو'' وہ میز دوسرے پلنگ پر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔

''کراچی؟''

''میری خالہ کے یہاں رہیں گے ہم، ساری تیاری ہو چکی ہے جلدی کرو''

''کیا کرو گی کراچی جا کر؟'' دونوں چونک پڑے۔ دیکھا تو دروازے سے نواز ٹیک لگائے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کافی تیار تھا وہ۔ نئی سفید شلوار قمیض اور کلائی پر بندھی سیاہ رنگ کی گھڑی۔ ہاتھوں میں کوئی سفید ڈبیا تھی جس کو وہ ایک لٹو کی طرح گھما رہا تھا۔ وہ دھیرے سے اندر آیا اور پلنگ کی چادر کو ہاتھوں سے جھاڑ کر بیٹھ گیا۔

''نواز میاں آپ نکلیں یہاں سے!'' گلشن نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''No Problem Madhuri...... میں نکل بھی گیا تو کوئی آنند تم دونوں کو بچانے کے لیے نہیں آنے والا...... ہا ہا چھے!'' وہ چٹکی بجا کر قہقہہ لگاتے ہوئے چلا گیا۔

گلشن نے مڑ کر اجالا کو دیکھا۔ قہقہہ مدھم ہوتا گیا اور لڑکیوں عورتوں کا شور بڑھتا چلا گیا۔

Hovac Amatoxin کی نیلی شیشی ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی اور گلشن نے چونکی اور غور سے شیشی کو دیکھنے لگی۔

''اونہہ...... کیوں، دعاؤں پر سے یقین اٹھ گیا؟'' گلشن نے جھک کر شیشی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''دعائیں قبول نہ ہوئیں تو اس کے بعد ملنے والے زخموں کی دوا ہے یہ!'' اجالا کی پلکیں لرزنے لگیں اور مہندی سے خالی ہاتھ آنکھوں میں ابھرتی سمندر کو روکنے لگے۔

''یقین نہ ہو تو کب قبول ہوتی ہیں یہ دعائیں''

''تم بتاؤ کیا کریں گے اب! کیا کریں گے؟!'' وہ پاس کرسی پر بیٹھ گئی اور کانپتی پلکوں سے نیچے دیکھنے لگی۔

''اجالا نہیں کتنے بھی ستم ٹوٹ پڑیں ہم دونوں پر، کتے کتنی ہی بوٹیاں اڑا لے جائیں، اتنا بڑا ستم نہ کرنا اپنے آپ پر...... مجھ پر'' اس نے اجالا کے ہاتھ میں شیشی واپس تھما کر مٹھی بند کر دی اور جلدی سے منہ پھیر لیا۔ چند لڑکیاں داخل ہوئیں نمرہ کے پیچھے۔ ان کے پاس جوڑے تھے اور بھی بہت سی چیزیں تھیں۔ پورے کمرے میں الگ الگ خشبوئیں پھیل گئیں۔ کپڑوں کی، لڑکیوں کی، مہندی کی۔ ایک لڑکی نے دروازہ بند کر دیا۔

''نکاح جلدی ہوگا...... تھوڑی دیر باقی ہے'' نمرہ نے کہا اور مڑ کر ایک لڑکی کو دیکھا جس نے آگے بڑھ کر پلنگ پر تین چار مختلف رنگوں کے جوڑے رکھ دیئے۔

☆☆☆

سورج ڈوب چکا تھا۔ اس نے گلی کے نکڑ پر رکتے ہوئے بنگلے کو دیکھا۔ یہاں سے صرف بالکونی نظر آ رہی تھی۔ بیچ میں موٹے موٹے پیڑ راستہ روکے ہوئے تھے۔ ''یہ گرم ہو جائے گی کیونکہ اس سے تھوڑی دیر میں گولیاں نکلیں گی'' وہ پستول کی ٹھنڈی نالی پر انگلی پھیرتے ہوئے بڑبڑایا۔

اس کے بوٹوں کے پاس ہی وہ جگہ تھی جہاں وہ روہت کا سر اپنی گود میں رکھ کر رویا تھا۔ روہت سے ماتھے سے نکلتا خون اس کے کپڑوں پر لگا تھا۔ وہ داغ کپڑوں پر اب بھی موجود تھے لیکن اندھیرے میں نظر نہیں آتے

تھے۔ پاس ہی وہ کونا تھا جہاں اس بچی کو گولی لگی تھی۔ دیوار پر خون کے چھینٹے اسی طرح موجود تھے۔ یہ تعجب تھا کہ اتنی چھوٹی سی بچی اتنے قریب سے گولی لگنے کے باوجود بھی بچ گئی تھی۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ چند شاپر ہوا سے تنگ کر دیوار سے اپنا سر ٹکرار ہے تھے۔ کوئی بھی اینٹ موجود نہ تھی۔ نہ جانے وہ اینٹ کہاں ہوگی جس نے کسی کا سر توڑا تھا، اس سے بھیجا نکالا تھا اور اپنی بھوری رنگت کو سرخ سے سرخ تر بنا دیا تھا۔ نہ جانے وہ اینٹ اب کہاں ہوگی۔ وہ سوچتے سوچتے رک گیا اور بنگلے کی جلتی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

پانچ گولیاں! اس نے دوبارہ دیکھیں اور ٹریگر پر انگلی رکھ کر وہ بنگلے کی طرف چلنے لگا۔ چند گاڑیاں باہر کھڑی تھیں۔ دو قہقہوں کی آواز آئی۔ دو نوکر کرسیوں پر باہر بیٹھے مٹھائی کھا رہے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ انگلی ٹریگر پر جمی ہوئی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے ٹریگر سے انگلی ہٹائی اور پستول کو پتلون میں چھپا کر وہ روشنی میں داخل ہو گیا۔ دو نوکر کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں اور وہ چپ ہو کر مٹھائی کھانے لگے۔

''میں نواز کا دوست ہوں، وہ......''

نوکر نے بات کاٹی: ''ارے ساب، آپ اب آ رہے ہو، نکاح تو کب کا ہو گیا!'' دل اور دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور ٹانگیں بے اختیار لڑکھڑا گئیں۔ وہ ٹھنڈی زمین پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

دونوں نوکر مٹھائی چھوڑ کر خاموش اسے تکنے لگے۔

''کا ہوا! کا ہوا ساب؟!'' وہ آہستہ آہستہ پیروں پر کھڑا ہوا۔

''اب کہاں ہیں؟ اب......نواز؟'' نوکر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ دفعتاً دور کسی گاڑی کا ہارن بجا۔ ہیڈ لائٹ کی تیز پیلی روشنی میں اندر بیٹھنے والے نظر نہ آئے۔ دونوں نوکر بھاگتے ہوئے چلے گئے اور وہ تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ پستول پتلون سے نکل کر اس کے ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا اور ٹریگر پر انگلی خاصے تناؤ میں رکھی ہوئی تھی۔

لان خالی پڑا تھا۔ گھاس پر اوپر ٹھنڈ کی پتلی سفید سی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ چند قدموں کے نشان واضح تھے۔ گیرج میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سامنے ایک کھڑکی سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ وہ لان میں سے گزرتے ہوئے اس کھڑکی کی جانب بڑھنے لگا۔ اندر چند سے لڑکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر چند قہقہے بالکونی والے حصے سے آئے۔

وہ جلدی سے پودوں کے ساتھ ہو کر اندھیرے میں شامل ہو گیا اور کھڑکی کے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا...... وجئے!...... کمال الدین! اور دو اور آدمی تھے۔ کمال الدین سگار پی رہے تھے اور سامنے کی میز پر چند بندوقیں پڑی تھیں ان گلاسوں کے پاس جن مین وجئے شراب انڈیل رہا تھا۔

چھ گولیاں!...... اس نے دوہرایا اور ہولے سے دروازے کو کھولا۔ دروازہ نے ہلکی سی ''چراں'' کی آواز نکالی اور پستول پر ہتھیلیوں کی گرفت مضبوط کی جن پر پسینہ آنے لگا تھا۔ گیلری میں آدھی روشنی پڑ رہی تھی کچھ ساتھ والے کمرے سے آ رہی تھی اور کچھ سیڑھیوں کے اوپر سے۔

پیچھے سے کسی نے اس پر گولی چلائی! گولی کندھے کو چھوتی ہوئی دیوار میں جا لگی۔ وہ بھاگ کر اندر داخل ہو گیا۔ دو تین اور گولیاں! پاس والے کمرے سے کوئی چیزیں اٹھانے رکھنے کی آوازیں آنے لگیں۔

باہر والا آدمی گیرج کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دانیال نے ایک گولی چلائی جو سیدھی اس کی کمر میں جا کر لگی۔ اس کی کمر اکڑی، درد کی وجہ سے چہرہ آسمان کی طرف اٹھا اور وہ نیچے گر گیا۔ کمر کے دھبے کا رخ آسمان کی طرف تھا جو حجم میں بڑھتا جا رہا تھا اور مزید بڑھتا جا رہا تھا۔

سیڑھیوں کے اوپر سے چند چیخوں کی آواز سنائی دی۔ پستول اس نے دروازے سے آتی روشنی کی طرف تان دیا جس میں کچھ سائے ہل جل رہے تھے۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اچانک اندر گھس کر جب اس نے پستول کا نشانہ اندر باندھا تو اندر کوئی نہیں تھا! سامنے ایک دروازے بند پڑا تھا۔ وہ قدم بڑھاتے بڑھاتے رک گیا جب اس نے ایک سیاہ صوفے کو ایک جھٹکا کھاتے دیکھا۔

یکا یک اس سیاہ صوفے کے پیچھے سے ایک آدمی بندوق اٹھائے بلند ہوا۔ دانیال نے فوراَ دیوار کی آڑ لے لی۔ اوپر سے آتی چیخیں بندوق کی گھن گرج کے نیچے دب گئیں۔ شراب کے گلاس پورے زور سے ٹوٹنے لگے اور دیوار اور دروازہ گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔

بندوق جیسے ہی رکی اس نے اندر جھانک کر فائر کیا جو سیدھا اس آدمی کے بالوں سے بھرے سینے میں جا لگا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ وہ بھی پاس ہی ڈھیر ہو گیا۔ اس کے پاس والا آدمی اس کی بندوق اٹھا رہا تھا۔ دانیال نے گولی چلائی جو اس کی موٹی گردن میں لگی۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔ گردن سے نکلتا فوارا دیوار کو لال کرنے لگ گیا۔

''ٹھاہ'' کی آواز سے بند دروازہ کھلا...... وجئے نے دھاڑ کر پستول کی پانچ گولیاں چلائیں

۔تین چوک گئیں۔ایک گولی نے پنڈلی میں سوراخ کر دیا جبکہ دوسری اس کے بازو میں جا لگی۔

کلک۔کلک۔کلک۔گولیاں ختم، وجئے کا چہرہ اتر گیا۔

دھائیں! دھائیں!......دانیال نے پنڈلی پر جھکے جھکے دو گولیاں چلائیں! دونوں وجئے کے چوڑے ماتھے میں گھس گئیں اور وہ دیوار پر پھسلتا ہوا نیچے گر گیا۔دانیال نے اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کو دیکھا جو اسے دیکھ رہی تھیں اور جن میں مسلسل خون گھستا چلا جا رہا تھا۔دانیال بڑی بڑی سانسیں لیتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ گیا۔پستول کا رخ کبھی ان صوفوں کی طرف ہو جاتا تو کبھی اس دروازے کی طرف جہاں سے وجئے نکلا تھا۔ٹریگر پر جمی انگلی کانپ رہی تھی اور چہرے پر بری طرح پسینہ آ رہا تھا۔پستول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

پستول میں ایک گولی باقی تھی......

زمین پر پڑی شراب پر بوٹ رکھ کر وہ گزرا۔بوٹ کے نیچے سے چھوٹی سی چھپ کی آواز آئی۔دروازہ ایک تاریک کمرے میں کھلتا تھا۔وہ تیزی سے اندر گھسا اور بجلی کے بٹن ٹٹولے۔بلب روشن ہو گیا۔اچانک پردے کے پیچھے سے کمال الدین نکلا اور چھری زور دانیال کے ہاتھ میں گاڑھ دی۔ٹریگر دب گیا!

گولی بلب کو جا لگی! اس نے پستول پھینکا جو دور جا گرا۔کمال الدین ان اس کے سینے میں چھری مارنے کی کوشش کی لیکن چھری بازو میں داخل ہو گئی جہاں خون کے دھبے تھے، جہاں گولی لگی تھی۔

کمال الدین چھری واپس کھینچ کر پستول کی جانب لپکا اور دروازے سے آتی روشنی میں اسے ادھر ادھر ڈھونڈنے لگا۔دانیال دروازے کے سامنے وجئے سے ایک قدم دور پڑا اکٹھا ہوتا جا رہا تھا۔

وجئے کا پستول! سامنے اس کو نظر آیا۔وہ اس کی طرف رینگنے لگا لیکن پستول پر وجئے کی انگلیاں جنبش کر رہی تھیں۔معلوم نہیں وہ کیسے زندہ تھا سیدھی ماتھے میں گولیاں لگی تھیں لیکن وہ زندہ تھا بس کچھ دیر کے لیے زندہ تھا۔

دانیال وجئے کی طرف دھیرے دھیرے رینگا پر آدھے راستے میں ہی اچانک کمال الدین کا بھاری بوٹ اس کی کمر پر پڑا۔وہ بالکل ہل نہ سکا اور اسے سینے میں خون رستہ محسوس ہوا۔کمال الدین نے زور سے بازو پر لات ماری۔وہ تڑپا۔دو اور زوردار لاتیں ماریں اور دانیال تڑپتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔کمال الدین کا بھاری بوٹ اب اس کی چھاتی پر دھرا تھا۔ایک چیخ اس کے منہ سے نکلی۔

''تو آنند......'' کمال الدین جھکا اور پستول اس کے دل کے اوپر رکھتے ہوئے بولا۔

''تو ڈر لگ رہا ہے نہ اب!'' اس نے ایک زناٹے دار تمانچہ دائیں گال پر مارا۔ وہ اس کی ڈوبتی آنکھیں دیکھتا رہا پھر قہقہہ لگاتے ہوئے کہنے لگا: ''اب تمہیں زندگی بھر سسکا سسکا کر مارنے کا کوئی فائدہ نہیں !ایک ہی بار پہ مارتے ہیں! وہ تم سے پیار ہی نہیں کرتی! ہاہا! اور میں سمجھا تھا وہ کرتی ہے! ہاہا! اصل چوٹ تو تمہارے لیے یہی ہے کہ یہ جان کر مرو کہ جس کے تم دیوانے بنے پھرتے ہو......اس کو تم سے کوئی محبت بھی نہیں!......آہا! چچ چچ چچ!!......اب تم بھی وہیں جاؤ جہاں خاور کو بھیجا تھا تم نے!''

کلک! کلک! کلک!......کمال الدین نے آنکھیں پھاڑ کر پستول کی نالی کو دیکھا۔ پھر پستول پھینک دیا اور ساتھ پڑی سرخ چھری اٹھالی۔ دانیال پر جھکا اور گلے پر چھری رکھ دی۔

''خدا حافظ!'' دانیال کو چھری میں آتے تناؤ کا احساس ہوا۔ چھری چلنے ہی والی تھی کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ کمال الدین دھک سے پاس گر گئے۔۔۔ وجے!

اس نے لیٹے لیٹے پستول کو الٹا کر گولی چلائی تھی۔ دانیال کی قسمت تھی کہ وہ فائر اس کے بجائے کمال الدین کو لگ گیا۔۔ گولی گردن پر پڑی تھی۔ کمال الدین کا منہ بھنچا ہوا تھا اور گردن پوری لال ہو رہی تھی۔ دانیال کہنی کا سہارا لے کر بیٹھا اور مڑ کر وجے کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ دانیال قریب ہوا۔

''معا......ف......کر دین......ا......آہ!'' اور اس کی گردن ایک طرف گر گئی۔ دانیال نے اپنا بازو پکڑ کر آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی۔ وجے کا پستول اٹھا کر وہ کچھ کھڑا اکھڑی اکھڑی سانسیں لیتا رہا پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ لان سے جھینگروں کی چرچر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ پنڈلی سے خون کے موٹے موٹے قطرے سفید سیڑھیوں پر گرے۔

اوپر سے ہلکی کھسر پھسر کی آواز آ رہی تھی۔ کسی کے رونے کی۔ نیم کھلے دروازے سے دودھ کی طرح سفید روشنی نکل رہی تھی۔ وہ دروازے کے سامنے جا کر رک گیا۔ پستول کو اپنے خون آلود ہاتھوں میں سہی سے پکڑا اور دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ دیوار سے ٹکرا کر وہیں رک گیا۔

نواز پلنگ پر مردہ پڑا تھا!......کمرے کے ایک کونے میں نمرہ فرش پر بے ہوش پڑی تھی اور بڑی ماں اس کے پاس بیٹھیں خاموش آنسو بہا رہی تھیں اور اجالا......اجالا بیٹھی تھی پلنگ پر دوسری طرف منہ

کیے! اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے! کمر پر ناخنوں کے نشان تھے اور بال بگڑے ہوئے تھے۔

بڑی ماں نے چونک کر اس کو دیکھا اور زور زور سے رونے لگیں۔ وہ اندر داخل ہوا کمرے کے بیچ میں جا کر کھڑا ہو گیا جہاں نیچے ایک نیلے رنگ کا دبّہ پڑا تھا۔ پستول ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے سفید فرش پر گر گیا۔ ہاتھ سے چند قطرے خون کے اتر کر اس پستول پر پھیل گئے۔

اس نے نواز کی طرف دیکھا......

گریبان کھلا ہوا ہے۔ بٹن ٹوٹے ہوئے ہیں۔ وہ قمیض جو کبھی سفید تھی اب بالکل لال ہونے والی ہے۔ اِزار بند پلنگ سے نیچے جھول رہا ہے اور دائیں ٹانگ نیم برہنہ ہے!

چھری سینے میں اور بائیں آنکھ میں گاڑھی گئی تھی۔ وہ چھری پاس ہی پلنگ کی چادر کی سلوٹوں میں چھپی پڑی تھی جس کی نوک پر سرخ مائع جم چکا تھا۔ اس کی نظر نواز کے منہ پر بھنبھناتی دو مکھیوں اور مچھروں پر گئی۔ بائیں آنکھ پر اور سینے پر مچھر مکھیاں پھدک رہے تھے۔

وہ اجالا کی طرف بڑھا جو پتھر بنی بیٹھی تھی۔ وہ کانپتی ٹانگیں لیے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اجالا کی نیم بند آنکھیں جھکی ہوئی لرز رہی تھیں۔ دائیں گال پر ناخنوں کے اور بائیں گال پر کسی کے دانتوں کے نشان تھے۔ اجالا نے اوپر نہ دیکھا۔

اس کے ہاتھ میں کوئی شیشی تھی چھوٹی سی، جس میں چند قطرے بچے ہوئے تھے ایک نیلے رنگ کے مائع کے......دفعتاً جیسے اس کو ہوش آیا۔ نظریں اٹھیں! اور پھیلتی چلی گئیں!

شیشی ہاتھ میں سے پھسل گئی اور نیچے گر کر ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ وہ بنا پلک جھپکائے اس کو دیکھتے ہوئے اٹھی اور اس کے سینے کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دانیال نے اس کے ملائم بالوں پر اپنا خون آلود ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بہت بری طرح سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

''میرا بچہ! آہ! میرا بچہ!'' اچانک نمرہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی اور نواز کی طرف بھاگی۔ وہ پلنگ پر چڑھ گئی۔ کبھی وہ سینے پر ہاتھ رکھ کہ آنسو بہاتی تو کبھی وہ خون زدہ آنکھیں چومتے ہوئے روتی۔ وہ بائیں آنکھ پر سے مکھیاں مچھر اڑاتی جس پر ایک ترچھی لکیر سی بنی ہوئی۔ مکھیاں مچھر واپس بائیں آنکھ پر آ بیٹھتے۔

''میرا بچہ! میرا نواز!......میرا! میرا نواز!!'' وہ سینے پر سر رکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ کونے میں بیٹھی بڑی ماں سر جھکا کر آنسو بہانے لگیں۔

اسی لمحے کہیں دور مدھم شور کی آواز سنائی دینے لگی!......دانیال اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے گیا۔ بیچ میں وہ پستول پڑی۔ دانیال نے نیلا دبٹہ اٹھایا اور اجالا کے سر کو ڈھانپ دیا پھر نیچے سے پستول اٹھا کر اس کا ہاتھ پکڑے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آخری باب

......زخم اور دوا......

کراچی جانے والی گاڑی لیٹ تھی۔اس نے ننگی پٹڑیوں کو تکنا بند کر دیا اور آہستے سے دانیال کے ساتھ جا بیٹھی جو میر پور جانے والے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔

دور دو بزرگ بیٹھے ریڈیو سن رہے تھے:

''میجر جنرل کمال الدین کی موت......(ریڈیو میں کچھ گڑبڑ ہوئی)......پولیس تلاش کر رہی......(پھر سے کوئی گڑبڑ)......پکڑ لیا جائے گا! اب آپ سنیئے......''بوڑھے نے ریڈیو بند کر دیا اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔بوڑھوں کے پاس ہی ایک میلے کچیلے برقعے میں لپٹی عورت بچے کو سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔اس کا میلا برقعہ سیاہ رنگت رکھنے کی وجہ سے زیادہ برا نہیں لگ رہا تھا۔دو سال کا وہ سویا ہوا بچہ کلکاریاں مارتے ہوئے اٹھ بیٹھا اور رونے لگ گیا۔

''پھر زہر کا کیا ہوا؟''گلشن نے اجالا سے پوچھا تو دانیال اور عقیل چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔اجالا برقعے میں تھی۔سفید رنگ کا برقعہ جو اس کو گلشن نے دیا تھا۔

''میں پینے لگی تھی تو......تو نواز نے روک لیا تھا......سارا نیچے گر گیا......''وہ بولی۔ہوا کے تیز جھونکے چلے اور بچہ کو چپ کرنے والی عورت کا سیاہ برقعہ پھڑ پھڑانے لگا۔اب وہ جھونکے گاڑی کی آواز اپنے

ساتھ لانے لگے۔چیختی چلاتی مسافروں سے لدی ہوئی ٹرین سٹیشن پر پہنچ گئی۔وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

تاروں سے آسمان بھرا ہوا تھا۔گاڑی سے اترتے ہوئے مسافروں کی بھیڑ لگ گئی۔وہ چاروں سٹیشن سے نکلے۔تلاش کیا بنا ہی ٹیکسی مل گئی۔

اجالا کا چہرہ شہر کی جگمگاتی روشنیوں کی طرف تھا۔ٹریفک کا شور، گاڑی کے ہارن، عقیل گلشن کی باتیں......اس کی خوشی کے خیالوں کے نیچے دھنستے چلے جا رہے تھے۔اس نے اگلی سیٹ پر بیٹھے دانیال کی طرف دیکھا اور دل کو بیش بہا آنند ملا (سکون)۔

گاڑی ٹریفک میں پھنس گئی تو وہ مسکرا مسکرا کر ان پھول بیچنے والے بچے بچیوں کو دیکھنے لگی۔دو دوڑتے ہوئے دانیال کے گئے۔شیشہ کھٹکھٹایا تو اس نے کھل دیا۔

"فھول لے لو صاب" اس نے ایک گلاب خریدا اور دو گیندے کے پھول خرید لیے اور مڑ کر ان تینوں کو دے دیئے۔

عقیل بول اٹھا: "یہ کیا! ہمیں گیندے کے پھول اور اجالا آپا کو گلاب!" گلشن ہنس کر اس کی کمر پر چپت ماری اور اجالا کھلکھلا کر گلاب کو سونگھنے لگی۔اب ان گلابوں کو کوئی نہیں کچل پائے گا، وہ سوچ کر کھل اٹھی۔

لمبی سیڑھیاں چڑھ کر وہ ان کے لکڑی کے دروازے تک پہنچے۔گلشن نے ہنس کر دروازہ بجایا۔خالہ بڑی ہنس مکھ عورت تھیں۔ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں وہ بلکل بڑی ماں کی طرح لگ رہی تھیں۔ہاتھ میں ویسی ہی ایک تسبی تھی۔ان کو دیکھ کر وہ کیسے خوشی سے اچھل پڑی تھیں۔

ان کا مکان چھوٹا سا تھا۔جب ان کو عقیل گلشن نے سب بتایا تو وہ پہلے سر جھکا کر کوئی دعائیں پڑھتی رہیں۔پھر جلدی سے اٹھ کر باہر چلی گئیں اور جب وہ آدھے گھنٹے بعد لوٹیں تو کوئی مولوی صاحب تھے ان کے ساتھ! دانیال اور اجالا کا نکاح ہو گیا!

نہ شہنائیاں بجیں، نہ ڈھول بجے، نہ تالیاں بجیں، لیکن دونوں کو لگ رہا تھا جیسے پورا جہان ہی ان کے سنگ ہنس رہا ہے، مسکرا رہا ہے اور وہ چاند......

وہ چاند ان کی خوشی میں خوش ہو رہا ہے جیسے مسکرا رہا ہے۔

☆☆☆

''اور روہت نے بات کیا جانی تھی؟'' کافی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولی۔ وہ چھت پر پڑی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ ہلکی خنکی اور تیز دھوپ تھی جس سے آنکھیں چندھیا جاتیں۔ اس نے سائے میں گھور کر جواب دیا؛ ''نہیں کچھ نہیں پتہ، میں نہ پوچھ پایا اور نہ اس نے مجھے بتایا'' دانیال کی بھوری آنکھیں دھوپ میں لرزیں۔ اس نے سر جھکا لیا۔ وہ کریم رنگ جرسی جو اس نے پہن رکھی تھی گرم ہو کر جیسے جلانا شروع کر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھکڑ چلا اور اجالا کے ملائم بالوں کی ایک لٹ پھسلی۔ وہ مسکرایا اور آگے بڑھ کر اس لٹ کو اس کی جگہ پر پہنچا دیا۔

☆☆☆

(دو ہفتے بعد)

بکھرے بال...... بکھری بکھری آنکھیں...... اس نے جلتے پردوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ جل گیا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔ پھر کھلکھلائی اور دوبارہ آگ کو چھونے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر آدھے راستے میں ہی واپس کھینچ لیا۔

جلتے پردوں کے پیچھے کھڑکی میں اس نے گھورا۔ بڑی ماں چند نوکروں سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ پلنگ کے ساتھ ہی نیچے گر گئی۔ پھر دھیرے دھیرے سجدے میں پہنچی اور رونے لگی۔ روتی رہی اور روتی رہی اور دوبارہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے...... سینہ نوچ ڈالا اور بالوں کا گچھا اکھیڑ ڈالا......

وہ بے ہوش ہو گئی! نوکر دروازہ بجاتے رہ گئے۔ پھر دروازہ توڑا گیا۔

اس کو ہوش آیا۔ جل چکے پردوں کے ساتھ والی کھڑکیوں سے شام کی مدھم روشنی آ رہی تھی۔ بڑی ماں جھولنے والی کرسی پر بیٹھی تسبی پڑھ رہی تھیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی اور بڑی ماں چونک پڑیں۔

''لیٹی رہو، لیٹی رہو'' انہوں نے اسے بڑے سے پلنگ پر دوبارہ لیٹاتے ہوئے کہا۔

وہ سوچتی رہی اور پھر سو گئی۔ کوئی پہلی آذان ہو رہی تھی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمبل کو اس نے دھکیلا اور پاس دیکھا۔ بڑی ماں ہاتھوں میں تسبی پکڑے پکڑے سو گئی تھیں۔

ان کی پلنگ کے ساتھ ٹیک لگی ہوئی تھی۔ اس نے باریک اجالے میں سامنے میز پر پڑی ہوئی نواز کی تصویر دیکھ لی۔ دو آنسو!...... اور پھر ان کی جگہ بھیانک غصے نے لی۔

دفعتاً اس نے اپنے سر کے نیچے سے سرہانہ نکالا اور بڑی ماں کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ جاگ پڑیں اور مدافعت کرنے لگیں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھیں لیے مزید مزید دباؤں دیتی جا رہی تھی۔ اور پھر تسبی ہاتھوں سے

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی۔ان کا جسم ایک طرف لڑھک کر پلنگ سے نیچے ایک دھماکے کے ساتھ گر گیا۔اس نے پوری قوت سے سرہانہ نواز کی تصویر کی طرف پھینکا۔تصویر گر گئی اور شیشے ہر جگہ پھیل گئے۔

وہ پلنگ سے اتری اور لاش کو چیخ چیخ کر کافی دیر لاتیں مارتی رہی۔وہ تصویر کی طرف بھاگی اور اس کو اٹھا کر سینے سے لگایا۔شیشے کا ایک بڑا ٹکڑا پاس پڑا تھا۔اس نے اٹھا کر اپنی شاہرگ پر چلا دیا۔

ابلتا ہوا لاوا کی طرح خون نکلنے لگا۔ہاتھ سرخ ہو گیا۔اس نے گلے میں شیشہ گاڑھ دیا پھر اپنی بائیں آنکھ میں......اور مسکراتے ہوئے وہ ایک طرف گر گئی............

☆☆☆

ختم شد